جلد ۷۶ نومبر ۱۹۷۱ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

کتابیں

اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی

آپ اچھی کتابیں پڑھیں

—کیونکہ—

آپ کو خود اچھا بننا ہے
اور دوسروں کو اچھا بنانا ہے

اچھی اچھی کتابوں کا مرکز

مکتبہ الخلیل: ۴۲۔ اُردو بازار لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۶	نومبر ۱۹۷۱ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ	عدد ۳

مغربی پاکستان		مشرقی پاکستان
چندہ سالانہ : آٹھ روپے	ماہنامہ ترجمان القرآن	سالانہ (ہوائی ڈاک) ۱۰ روپے
فی پرچہ : ۸۰ پیسے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور	فی پرچہ (″) ۹۰ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

مادی تہذیب اور اس کے مضر اثرات نے ہمارے ذہنوں کو اس قدر ماؤف کر دیا ہے کہ ہمیں زندگی کے مختلف میدانوں میں اس تہذیب کی متعین کردہ راہوں کے سوا کوئی دوسری راہ نظر نہیں آتی۔ سیاست میں ہماری آنکھوں کے سامنے یا تو سرمایہ دارانہ جمہوریت گھومتی ہے یا اشتراکی آمریت۔ معیشت میں ہماری نگاہوں کے سامنے صرف دو نقشے ہی اُبھرتے ہیں، یا اخلاق سے عاری آزاد اور بے لگام سرمایہ پرستی یا پھر اشتمالیت کی جکڑبندیاں۔ یہی حال معاشرت، قانون، ادب اور مذہب کا ہے۔ حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں میں اہلِ مغرب نے جن خطوط کی نشاندہی کر دی ہے، وہی ہمارے نزدیک صحیح خطوطِ خیال کیے جانے لگے ہیں اور ہمارے اندر یہ احساس تک باقی نہیں رہا کہ ہم اپنی الگ ایک صراطِ مستقیم بھی رکھتے ہیں جو ہمیں زندگی کے ہر میدان میں حق وصداقت کی راہ پر گامزن رکھتی ہے۔ دُور نہ جائیے صرف ایران کے ساتھ ہمارے مخلصانہ روابط اور ثقافتی تعلقات کے اظہار کو ہی لیجیے۔ ہم ان تعلقات اور روابط کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں مزید استحکام پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایران کے خلوص کے بھی دل و جان سے معترف ہیں۔ مگر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر یہ کیونکر فرض کر لیا گیا ہے کہ ان مخلصانہ تعلقات کے اظہار کا لے دے کر صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے جو ہمیں اہلِ مغرب نے بتایا ہے یعنی نمود و نمائش، رامش و رنگ کی محفلوں کا انعقاد، اسراف و تبذیر اور اسی طرح کے دوسرے بیکار بلکہ بعض حالات میں اخلاق سوز مشاغل۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ہمیں خوشی کے اظہار کا کوئی طریقہ نہیں بتایا یا کتاب وسنت سے ہمیں اس معاملے میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی؟ دوسرے ممالک اور قوموں کی ہر معاملے میں اندھی تقلید تو ان لوگوں کو زیب دیتی ہے جو زندگی کے بارے میں اپنا کوئی مخصوص نقطۂ نگاہ یا پروگرام نہ رکھتے ہوں یا جنہیں دنیوی مفادات کی محبت نے اس قدر اندھا کر دیا ہو کہ وہ دنیوی تعلقات کی خاطر اللہ کے احکام کو پسِ پشت

ڈال دیں۔ یہ طرزِ عمل بہرحال اس قوم کو کسی طرح زیب نہیں دیتا جو ایک خاص نظریۂ حیات کی علمبردار بن کر دنیا میں جینے کا عزم رکھتی ہو اور دوسری اقوام کی پیروی کے بجائے ان کی قیادت کی دعویدار ہو۔

مختلف قوموں اور سلطنتوں کے مابین تعلقات کا قیام کوئی دورِ جدید کا مخصوص کارنامہ نہیں جب سے انسانوں نے اجتماعی زندگی کی بنیاد رکھی ہے اور اس کے نتیجے میں حکومتیں معرضِ وجود میں آئی ہیں اس وقت سے مختلف ممالک کے درمیان اخوت کے تعلقات بھی قائم ہوتے رہے ہیں۔ ماضی میں مسلم ریاستوں نے بھی اپنی حدود سے باہر نکل کر دوسرے ممالک اور قوموں کے ساتھ بھائی چارہ کے تعلقات قائم کیے۔ مگر جن مسلمان حکمرانوں کے دلوں میں اسلام سے محبت تھی انہوں نے کبھی بھی دین کو قربان کر کے ان تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دینی احکام کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں قائم کیا۔ اور پھر انہیں احکام الٰہی کے مطابق بنایا۔ اگر ہمارے اسلاف آبرومندانہ عہد و پیمان کے ساتھ اور دینِ حق کے پیروکار کی حیثیت سے بین الاقوامی برادری میں پُروقار انداز میں زندہ رہ سکتے تھے تو آخر ہم کیوں نہیں رہ سکتے۔ کیا ہم اپنی زندگی کا کوئی اسلوب نہیں رکھتے؟ کیا ہم کسی نظریۂ حیات کے ترجمان نہیں؟ کیا ہم کسی پیغام کے علمبردار نہیں رہے؟ کیا ہم ذہنی اور فکری اعتبار سے اتنے مفلس ہو چکے ہیں کہ دوسروں کی ہر چیز یا دوسروں کا ہر طرزِ عمل خواہ وہ اخلاقی اور دینی اعتبار سے کتنا ہی غلط ہو، ہمارے لیے باعثِ کشش بن جاتا ہے۔ ہمیں اپنی اس تقلید پسندانہ روش پر غور کرنا چاہیے۔

اسے ہم اپنی کسی دُور اندیشی پر محمول نہیں کرتے بلکہ محض خدا کا فضل سمجھتے ہیں کہ ہم نے ماضی میں اپنی قوم کو ہر نازک مرحلے پر آنے والے خطرات سے پُوری طرح خبردار کیا۔ غلام محمد نے جب مرکزی اسمبلی کو توڑا تو اس کے متوقع عواقب ہم نے پوری طرح واضح کیے اور بتایا کہ یہ فعل اس ملک کو آمریت کی طرف لے جانے والا ہے۔ چنانچہ جلد ہی فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں ایک آمرِ مطلق کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور انہوں نے جمہوریت کے ہر نشان کو بڑی چابکدستی سے مٹانے کی کوشش کی۔ اسی ضمن میں ہم نے قوم کو یہ بات بھی بار بار ذہن نشین کرائی کہ لادینی تحریکات خواہ کسی روپ میں جلوہ گر ہوں وہ لازمی طور پر اشتراکیت کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ لادینی تحریکوں کے بعض بظاہر معصوم پروگرام اشتراکیت

کو قریب تر لانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں مگر افسوس کہ قوم نے ہمارے اس انتباہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ غلام محمد کے احمقانہ فعل کو سراہا اور فیلڈ مارشل صاحب کے غلط طرزِ عمل کی مدح و توصیف کی اور انہیں قوم کا "نجات دہندہ" قرار دیتے ہوئے ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد جب ان کے اصل عزائم سامنے آتے اور قوم کی آنکھیں کھلیں تو انہیں ہٹانے کے لیے ایسے عناصر کی پشت پناہی شروع کر دی جو پہلے ہنگاموں کے ذریعے ملک کا نظام معطل کرتے ہیں اور پھر اس تعطل اور اضطراب سے فائدہ اٹھا کر اشتراکی آمریت عوام پر مسلط کر دیتے ہیں۔

ہم ملک میں کوئی سنسنی پھیلانا نہیں چاہتے مگر اس تلخ حقیقت کا اخفاء بھی ملک و ملت سے غداری خیال کرتے ہیں کہ اس وقت ملک میں جو اندوہناک صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے یا بعض تخریب پسند عناصر نے پیدا کر دی ہے اس میں اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ کہیں اشتراکیت کی بلا ملک پر نازل نہ ہو جائے یہ بات کسی طرح بھی بعید از امکان نہیں کہ اس سازش میں غیر ملکی طاقتیں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک ہوں۔ حالات کا دھارا جس رُخ بہ رہا ہے۔ اس سے اس امر کا صاف پتہ چلتا ہے کہ ملک کو اشتراکیت کی طرف ایک منصوبے کے تحت بڑی قوت سے دھکیلا جا رہا ہے اور وہ سارے ہتھکنڈے پوری عیاری اور طاقت سے استعمال کیے جا رہے ہیں جو اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے بالعموم استعمال کیے جاتے ہیں۔

جن لوگوں نے اشتراکی انقلاب کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ الحاد کے بطن سے یہ تحریک جنم لیتی ہے۔ بھوک، افلاس اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے چینی اسے توانائی فراہم کرتی ہے۔ ذہنی اور اخلاقی آوارگی کی گود میں یہ تحریک پلتی اور پرورش پاتی ہے، مکر و فریب، دھونس، دھاندلی اور تشدد کی مدد سے یہ اپنے لیے ترقی کی مختلف راہیں نکالتی اور بالآخر آمریت کے بل بوتے پر کسی ملک میں اپنا تسلط قائم کر لیتی ہے۔ امن کی فضا اسے کبھی راس نہیں آتی، دلیل کی قوت اس کے لیے کسی منزل پر بھی مفید اور کارآمد نہیں ہوتی، جمہوریت کا ماحول اس کے لیے کسی طور بھی سازگار ثابت نہیں ہوتا۔ امانت و دیانت اور شرافت سے اسے فطری کد ہے۔ اس کی فطرت کا خمیر ہی تشدد، سازش اور نامعقولیت سے اٹھایا گیا ہے۔ چنانچہ جب ملک کی سیاسی فضا میں سازشیں پرورش پانے اور

تشدّد کے مظاہرے ہونے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ اشتراکیت کی تاریکیاں اس ملک کو اپنے بھیانک پردوں میں چھپانے والی ہیں۔

بدقسمتی سے اس خطۂ پاک میں وہ ساری خوفناک علامتیں موجود ہیں جو اشتراکی فتنے کے برپا ہونے کی دہائی دے رہی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں کالعدم عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی نے الحاد کا زہر ملک کے بائیں بازو میں اچھی طرح پھیلا دیا ہے اور اس کے خطرناک نتائج آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس زہر کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان دینی اخوت کے رشتے ٹوٹے اور ملک کے بائیں بازو نے اپنے آپ کو پاکستان کا جزو لاینفک سمجھنے کے بجائے کسی دوسرے ملک سے ناطہ جوڑنے کی ناپاک کوششیں شروع کیں۔ اس زہر کے زیرِ اثر نہ صرف بھائی نے بھائی سے منہ موڑا بلکہ اس نے بےدریغ ہو کر اس کا گلا کاٹا اور جو لوگ اس میں مزاحم ہوئے انہیں تشدّد کے ذریعہ دبانے کی کوشش کی۔ مشرقی پاکستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا کہ پاکستانی قوم کے ایک بہت بڑے حصّہ پر دیوانگی کا عالم طاری ہے اور وہ جنون میں اپنے آپ کو برباد کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کے اندوہناک حالات معقولیت کے ذریعے تو پیدا نہیں کیے جا سکتے۔ اِس قسم کے مذموم مقاصد لوگوں کے جذبات بھڑکا کر ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ آگ اور خون کے اس کھیل کے کھیلنے میں وہ لوگ پیش پیش رہے ہیں جن کے قلب و دماغ پر الحاد چھایا ہوا ہے۔ تخریب پسندی جن کا پسندیدہ مشغلہ ہے اور منفی جذبات کو اُبھارنے میں جنہیں گوناگوں لذت محسوس ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان کی سرزمین صرف ایک دن میں تو آگ نہیں اُگلنے لگی بلکہ یہ گزشتہ بیس سال کے تخریبی رجحانات کا طبعی نتیجہ ہے۔ سطح بین آنکھوں کے لیے ممکن ہے کہ یہ کوئی غیر متوقع حادثہ ہو مگر جو لوگ حالات کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ رہے تھے اُن کے لیے اس امر کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی سرزمین انسانی خون سے لالہ زار بننے والی ہے۔

مشرقی پاکستان جس سنگین حادثہ سے دوچار ہوا ہے اُس کی زد میں اب مغربی پاکستان بھی بڑی تیزی کے ساتھ آ رہا ہے۔ حکومت کی غلط معاشی پالیسیوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی عاقبت نااندیشیوں

نے غریب طبقے پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ غربت، افلاس اور ہر آن بڑھتی ہوئی بیروزگاری ان کی زندگیوں پر دردناک عذاب کی صورت میں مُسلط ہیں۔ عوام کی عظیم اکثریت کو ہمیشہ یہی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ وہ کسی طرح جسم اور روح کے رشتے کو برقرار رکھ سکے۔ اس پر غضب یہ ہے کہ سدِ رمق کی صورت میں انہیں جو میسّر آتا ہے اُس کے بارے میں بھی انہیں اطمینان نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ملک کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام ہی اس انداز کا ہے کہ ذہن کو آسودگی اور قلب کو طمانیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہر وقت ایک خوف دماغ پر مُسلط رہتا ہے کہ کس وقت کیا حادثہ پیش آجائے۔ عدمِ اطمینان اور خوف و ہراس کی اس فضا میں لوگوں کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں اور وہ خوش کن تمناؤں اور دلفریب آرزوؤں کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ بھی عوام کے جذبات سے کھیلنے کی مہارت رکھتا ہو وہ فوراً لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن جاتا ہے اور وہ اندھے ہو کر اُس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔

ہماری درسگاہوں میں نوخیز نسلوں کو جس قسم کی تعلیم دی جا رہی ہے وہ اُنہیں اسلام کا علمبردار بنانے کے بجائے کفر و الحاد کا پرستار بناتی ہے ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر جسے شاید قدرت نے فطرتِ ابراہیمی پر پیدا کیا ہو۔ اور جس کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، ایک بہت بڑی تعداد اس تعلیم کو حاصل کر کے اسلام سے برگشتہ ہوئی ہے۔ اُسے خدا کا وجود ایک واہمہ، رسالت ایک خیالِ خام، اور حیات بعد ممات اور حشر و نشر اور اسی طرح کے دوسرے معتقدات جو اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، جہالت کی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ اخلاق اُس کے نزدیک بیکار کی زنجیریں ہیں جن کی مدد سے سرمایہ دار معاشرے کے کمزور طبقوں کا خون چوستا ہے۔ الغرض اسلام اور اسلامی تعلیمات جدید ذہن کے نزدیک ماضی کی مقدس داستانیں ہیں جن کا موجودہ زندگی میں کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی نگاہ میں انسانی فلاح و کامرانی کی ایک ہی صورت ہے کہ اہلِ مغرب جس طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے جا رہے ہیں ان کے ہمرکاب ہو کر بڑھا جائے۔ اور جس طرح سرمایہ داری اشتراکیت کی آغوش میں دم توڑنے پر مجبور رہے بالکل اسی طرح ہم بھی اسی آغوش میں پناہ لیں۔ کیونکہ اسے اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ نوجوانوں میں جو لوگ ذرا جری اور بیباک ہیں وہ ان خیالات کا برملا اظہار کرتے ہیں مگر جو

کمزور اور بزدل ہیں وہ اپنے دماغ میں تو اسی قسم کے خیالات کو پالتے ہیں مگر زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرتے لیکن اس بات سے آخر کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ جوں جوں اسلام اور کفر کے درمیان کشمکش تیز تر ہوتی چلی جا رہی ہے یہ بزدل طبقہ اپنا وزن کفر کے پلڑوں میں ڈالتا چلا جاتا ہے ۔ اس قسم کی تعلیم و تربیت نے ذہنی آوارگی کے ساتھ ساتھ اخلاقی انارکی کو بھی بڑی شدومد کے ساتھ پھیلایا ہے اور اس کے ہولناک اثرات ہم میں ہر شخص نہ صرف بڑے دکھ کے ساتھ دیکھ رہا ہے بلکہ بڑے کرب و اضطراب کے ساتھ محسوس بھی کر رہا ہے ۔ اشتراکیت کے علمبرداروں کے نزدیک اخلاق کی دنیا میں یہ انارکی بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ اس کے ذریعے سیاسی انارکی کا بازار گرم ہوتا ہے بلکہ ذہنی اور اخلاقی آوارگی اشتراکیت کی یلغار کے لیے مقدمۃ الجیش کا کام دیتی ہے ۔ آوارگی درحقیقت ذہنی خلفشار اور جذباتی انتشار کا نام ہے جو قوم بھی اس میں مبتلا ہو جاتی ہے تخریب اور بغاوت اُس کے پسندیدہ مشاغل قرار پاتے ہیں ۔ وہ قوم پھر مذہبی اور روحانی اقدار کو ہی پامال نہیں کرتی بلکہ معاشرتی بندھنوں، اخلاقی حدود و قیود اور ملکی آئین و ضوابط کو بڑی دلیری کے ساتھ کھلے بندوں توڑتی ہے ۔ اور اسی طرح ملک میں افراتفری پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے ۔

جب کسی معاشرے میں اس نوعیت کے طوفان اٹھنے لگتے ہیں تو پھر ایسے قائدین بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو ان طوفانوں کا رُخ موڑ کر اُس معاشرے کو تہ و بالا کر دیتے ہیں یہ ہے مختصر الفاظ میں وہ پروگرام جس کے مطابق اسلامی ممالک میں اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں اسے دورِ جدید کے عظیم المیے کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملک جسے اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لیے بڑی قربانیوں سے حاصل کیا گیا تھا وہاں اشتراکیت کو مسلط کرنے کی بڑے زور شور سے تیاریاں جاری ہیں ۔ خدا اس قسم کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملاتے لیکن اس وقت ملک میں جو صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے اُسے کسی طرح بھی اسلام کے مستقبل کے لیے نیک فال نہیں کہا جا سکتا ۔ اشتراکیت کا قافلہ جن شورشوں، ہنگاموں اور طوفانوں کے جلو میں آگے بڑھتا ہے انہیں یہاں اچھی طرح دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طوفان ابھی تک پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے سکے ۔ اور ان کی تندی اس حد تک نہیں بڑھی کہ ہمارا پورا معاشرہ اپنی فکری اور اخلاقی اور معاشرتی بنیادوں سے

اُٹھنے لگے مگر یہ سخت خوش فہمی ہو گی بلکہ خود فریبی ہو گی اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ابھی یہاں اشتراکیت کا کوئی خطرہ موجود نہیں۔

فکری اور اخلاقی آوارگی کے طوفان تو ایک طرف رہے یہاں تو وہ لوگ بھی بڑی تیزی سے اُبھر کر سامنے آرہے ہیں جو اُن مضطرب حالات سے فائدہ اٹھا کر اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے تجربے کر رہے ہیں۔ یہ لوگ جس انداز سے مختلف اوقات میں سیاسی چالیں چلتے ہیں انہیں دیکھ کر اس امر کا صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ فیلڈ چھوڑ کر صورتِ حال کا جائزہ لینے میں مصروف ہیں اور اگر انہیں ان حالات میں اپنی کامیابی کے کچھ بھی امکانات نظر آئے تو یہ انتہائی قدم اٹھانے میں کبھی بھی تأمل نہ کریں گے۔ تشدّد کا پرچار کر کے عوام کو مرعوب کرنا اور اس طرح ان کے حوصلے پست کر کے انہیں مزاحمت سے باز رکھنا، پھر دھمکیوں کے ذریعے انتظامیہ کے اندر خوف و ہراس پیدا کرنا اور اسے اس حد تک مجبور کر دینا کہ وہ اپنے مستقبل کے تحفظ کے لیے سُرخ فوج کے جیالوں کے لیے طوعًا و کرہًا کام کرے، یہ عملی میدان میں اشتراکیت کے ابتدائی ہتھکنڈے ہیں جنہیں اس ملک میں گذشتہ دو تین سالوں سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ معاشرے کا جو طبقہ بھی اشتراکیت کی مخالفت کرتا ہے اور اس نظام کو مسلم قوم کے لیے سمِ قاتل سمجھتا ہے اس پر طعن کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور اُسے بڑے ذلیل حربوں سے عوام میں بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر انتظامیہ کے اندر بھی جس شخص کے بارے میں یہ گمان ہو کہ وہ ان کے ڈھب کا آدمی نہیں، اُسے بھی مختلف طریقوں سے خوفزدہ کیا جاتا ہے، تاکہ وہ میدان سے بھاگ کھڑا ہو اور اشتراکیت کے خونی ڈرامے کو جان کی امان پا کر غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے دیکھے۔ اس مرحلے پر دھونس اور دھمکیوں کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ معاشرے اور انتظامیہ میں ان طبقوں اور افراد کی قوت اور طاقت کا اندازہ کیا جا سکے جو اشتراکیت کی راہ میں مزاحم ہونے کا حوصلہ اور عزم رکھتے ہیں۔

خوف و ہراس کی یہ فضا اشتراکی انقلاب کا بالکل ابتدائی مرحلہ ہوتی ہے جس میں عوام کا ردِعمل کھل کر سامنے آتا ہے۔ اور اس کی روشنی میں مستقبل کا پروگرام ترتیب دیا جاتا ہے۔ پھر اس فضا میں بڑے معصوم بلکہ مقدس مقاصد کی آڑ میں ریڈ گارڈ کی بھرتی شروع ہوتی ہے اور عوام کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ

تفہیم القرآن

الفجر

نام | پہلے ہی لفظ اَلْفَجْر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اس کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب مکّۂ معظمہ میں اسلام قبول کرنے والوں کے خلاف ظلم کی چکّی چلنی شروع ہو چکی تھی۔ اسی بنا پر اہلِ مکّہ کو عاد اور ثمود اور فرعون کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع آخرت کی جزا اور سزا کا اثبات ہے جس کا اہلِ مکّہ انکار کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے جس طرح ترتیب وار استدلال کیا گیا ہے، اس کو اسی ترتیب کے ساتھ غور سے دیکھیے۔

سب سے پہلے فجر اور دس راتوں اور جُفت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر سامعین سے سوال کیا گیا ہے کہ جس بات کا تم انکار کر رہے ہو اس کے برحق ہونے کی شہادت دینے کے لیے کیا یہ چیزیں کافی نہیں ہیں؟ آگے حواشی میں ان چاروں چیزوں کی جو تشریح ہم نے کی ہے اُس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیزیں اُس قاعدگی کی علامت ہیں جو شب و روز کے نظام میں پائی جاتی ہے، اور ان کی قسم کھا کر یہ سوال اِس معنی میں کیا گیا ہے کہ خدا کے قائم کیے ہوئے اِس حکیمانہ نظام کو دیکھنے کے بعد بھی کیا اِس امر کی شہادت دینے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ نظام جس خدا نے قائم کیا ہے اُس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ آخرت برپا کرے، اور اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی باز پُرس کرے؟

اس کے بعد انسانی تاریخ سے استدلال کرتے ہوئے بطورِ مثال عاد اور ثمود اور فرعون

کے انجام کو پیش کیا گیا ہے کہ جب وہ حد سے گزر گئے اور زمین میں انہوں نے بہت فساد مچایا تو اللہ کے عذاب کا کوڑا اُن پر برس گیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ کائنات کا نظام کچھ اندھی بہری طاقتیں نہیں چلا رہی ہیں، نہ یہ دنیا کسی چوپٹ راجہ کی اندھیر نگری ہے، بلکہ ایک فرمانروائے حکیم و دانا اِس پر حکمرانی کر رہا ہے جس کی حکمت اور عدل کا یہ تقاضا خود اِس دنیا میں انسانی تاریخ کے اندر مسلسل نظر آتا ہے کہ عقل اور اخلاقی حس دیکر جس مخلوق کو اس نے یہاں تصرّف کے اختیارات دیئے ہیں اس کا محاسبہ کرے اور اسے جزا اور سزا دے۔

اس کے بعد انسانی معاشرے کی عام اخلاقی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں عربِ جاہلیّت کی حالت تو اُس وقت سب کے سامنے عملاً نمایاں تھی، اور خصوصیّت کے ساتھ اُس کے دو پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے۔ ایک، لوگوں کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر جس کی بنا پر وہ اخلاق کی بھلائی اور بُرائی کو نظر انداز کر کے محض دنیا کی دولت اور جاہ و منزلت کے حصُول یا فقدان کو عزت و ذلت کا معیار قرار دیئے بیٹھے تھے اور اِس بات کو بھول گئے تھے کہ نہ دولت مندی کوئی انعام ہے، نہ رزق کی تنگی کوئی سزا، بلکہ اللہ تعالیٰ اِن دونوں حالتوں میں انسان کا امتحان لے رہا ہے کہ دولت پا کر وہ کیا رویّہ اختیار کرتا ہے اور تنگ دستی میں مبتلا ہو کر کس روش پر چل پڑتا ہے۔ دوسرے، لوگوں کا یہ طرزِ عمل کہ یتیم بچہ باپ کے مرتے ہی اُن کے ہاں کس مپرسی میں مبتلا ہو جاتا ہے، غریبوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا، جس کا بس چلتا ہے مُردے کی ساری میراث سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور کمزور حق داروں کو دَھتا بتا دیتا ہے، اور مال کی حرص لوگوں کو ایک ایسی نہ بُجھنے والی پیاس کی طرح لگی ہوئی ہے کہ خواہ کتنا ہی مال مِل جائے ان کا دل سیر نہیں ہوتا۔ اِس تنقید سے مقصود لوگوں کو اس بات کا قائل کرنا ہے کہ دنیا کی زندگی میں جن انسانوں کا یہ طرزِ عمل ہے اُن کا محاسبہ آخر کیوں نہ ہو؟

پھر کلام کو اِس بات پر ختم کیا گیا ہے کہ محاسبہ ہوگا اور ضرور ہوگا اور وہ اُس روز ہوگا جب اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی۔ اُس وقت جزا و سزا کا انکار کرنے والوں کی

سمجھ میں وہ بات آجائے گی جسے آج وہ سمجھانے سے نہیں مان رہے ہیں، مگر اُس وقت سمجھنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ منکر انسان ہاتھ ملتا رہ جائے گا کہ کاش میں نے دنیا میں اس دن کے لیے کوئی سامان کیا ہوتا۔ مگر یہ ندامت اُسے خدا کی سزا سے نہ بچا سکے گی۔ البتہ جن انسانوں نے دنیا میں پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اُس حق کو قبول کر لیا ہوگا جسے آسمانی صحیفے اور خدا کے انبیاء پیش کر رہے تھے، خدا اُن سے راضی ہوگا اور وہ خدا کے عطا کردہ اجر سے راضی ہوں گے، انہیں دعوت دی جائے گی کہ وہ اپنے رب کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہوں اور جنت میں داخل ہو جائیں۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

قسم ہے فجر کی، اور دس راتوں کی، اور جفت اور طاق کی، اور رات کی جبکہ وہ رخصت ہو رہی ہو۔ کیا اس میں کسی صاحبِ عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟[1]

---

[1] اِن آیات کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے حتیٰ کہ جفت اور طاق کے بارے میں تو ۳۶ اقوال ملتے ہیں۔ بعض روایات میں اِن کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی تفسیر حضورؐ سے ثابت نہیں ہے، ورنہ ممکن نہ تھا کہ صحابہ اور تابعین اور بعد کے مفسرین میں سے کوئی بھی آپؐ کی تفسیر کے بعد خود اِن آیات کے معنی متعین کرنے کی جرأت کرتا۔

اندازِ بیان پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے سے کوئی بحث چل رہی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات پیش فرما رہے تھے اور منکرین اس کا انکار کر رہے تھے۔ اس پر حضورؐ کے قول کا اِثبات کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ قسم ہے فلاں اور فلاں چیزوں کی۔ مطلب یہ تھا کہ ان چیزوں کی قسم، جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں وہ برحق ہے۔ پھر بات کو اس سوال پر ختم کر دیا گیا کہ کیا کسی صاحبِ عقل کے لیے اس میں کوئی قسم ہے؟ یعنی کیا اِس حق بات پر شہادت دینے کے لیے اِس کے بعد کسی اور قسم کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا یہ قسم اِس کے لیے کافی نہیں ہے کہ ایک ہوشمند انسان اُس بات کو مان لے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ وہ بحث تھی کیا جس پر اِن چار چیزوں کی قسم کھائی گئی۔ اِس کے لیے ہمیں اُس پورے

مضمون پر غور کرنا ہوگا جو بعد کی آیتوں میں "تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا" سے شروع ہو کر سورۃ کے آخر تک چلتا ہے۔ اُس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ بحث جزا و سزا کے بارے میں تھی جس کو ماننے سے اہلِ مکہ انکار کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اِس بات کا قائل کرنے کے لیے مسلسل تبلیغ و تلقین فرما رہے تھے۔ اس پر فجر، اور دس راتوں اور جُفت اور طاق، اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر فرمایا گیا کہ اِس بات کو باور کرنے کے لیے کیا یہ چار چیزیں کافی نہیں ہیں کہ کسی صاحبِ عقل آدمی کے سامنے اور کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت ہو؟

اِن قسموں کا یہ موقع و محل متعین ہو جانے کے بعد لامحالہ ہمیں اِن میں سے ہر ایک کے وہ معنی لینے ہوں گے جو بعد کے مضمون پر دلالت کرتے ہوں۔ سب سے پہلے فرمایا "فجر کی قسم"۔ فجر پَو پھٹنے کو کہتے ہیں، یعنی وہ وقت جب رات کی تاریکی میں سے دن کی ابتدائی روشنی مشرق کی طرف ایک سفید دھاری کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ پھر فرمایا "دس راتوں کی قسم"۔ سلسلۂ بیان کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں۔ پہلی دس راتیں وہ جن میں چاند ایک باریک ناخن کی شکل سے شروع ہو کر ہر رات کو بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ آدھے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ دوسری دس راتیں وہ جن میں رات کا بڑا حصہ چاند سے روشن رہتا ہے۔ آخری دس راتیں وہ جن میں چاند چھوٹے سے چھوٹا اور رات کا بیشتر حصہ تاریک سے تاریک تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ مہینے کے خاتمے پر پوری رات تاریک ہو جاتی ہے اس کے بعد فرمایا "جُفت اور طاق کی قسم"۔ جُفت اُس عدد کو کہتے ہیں جو دو برابر کے حصوں میں تقسیم ہوتا ہے جیسے ۲-۴-۶-۸۔ اور طاق اُس عدد کو کہتے ہیں جو تقسیم نہیں ہوتا، جیسے ۱-۳-۵-۷۔ عمومی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس سے مراد کائنات کی تمام چیزیں ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ہر چیز یا تو جوڑا جوڑا ہے یا تنہا۔ لیکن چونکہ یہاں بات دن اور رات کی ہو رہی ہے، اس لیے سلسلۂ مضمون کی مناسبت سے جُفت اور طاق کا مطلب تغیرِ ایام ہے کہ مہینے کی تاریخیں ایک سے دو، اور دو سے تین ہوتی جاتی ہیں اور ہر تغیر ایک نئی کیفیت لے کر آتا ہے آخر میں فرمایا "رات کی قسم جبکہ وہ رخصت ہو رہی ہو"۔ یعنی وہ تاریکی جو سورج غروب ہونے کے بعد سے دنیا پر چھائی ہوئی تھی، خاتمے پر آ لگی ہو اور پَو پھٹنے والی ہو۔

اب اِن چاروں چیزوں پر ایک مجموعی نگاہ ڈالیے جن کی قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جزا و سزا کی جو خبر دے رہے ہیں وہ برحق ہے۔ یہ سب چیزیں اِس حقیقت پر دلالت کر رہی ہیں کہ ایک

تم نے[لہ] دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عادِ اِرَم کے ساتھ[سلہ] جن کے

رَبِّ قدیر اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے، اور وہ جو کام بھی کر رہا ہے بے تُکا، بے مقصد، بے حکمت، بے مصلحت نہیں کر رہا ہے بلکہ اُس کے ہر کام میں صریحًا ایک حکیمانہ منصوبہ کارفرما ہے۔ اُس کی دنیا میں تم یہ کبھی نہ دیکھو گے کہ ابھی رات ہے اور یکایک سُورج نصف النہار پر آ کھڑا ہُوا۔ یا ایک روز چاند ہلال کی شکل میں طلوع ہو اور دوسرے روز چودھویں رات کا پُورا چاند نمودار ہو جائے۔ یا رات آئی ہو تو کسی طرح اس کے ختم ہونے کی نوبت ہی نہ آئے اور وہ مستقل طور پر ٹھیر کر رہ جائے۔ یا تغیّرِ ایام کا سرے سے کوئی باقاعدہ سلسلہ ہی نہ ہو کہ آدمی تاریخوں کا کوئی حساب رکھ سکے اور یہ جان سکے کہ یہ کونسا مہینہ ہے، اس کی کونسی تاریخ ہے، کس تاریخ سے اُس کا کونسا کام شروع اور کب ختم ہوتا ہے، گرمی کے موسم کی تاریخیں کونسی ہیں اور برسات یا سردی کے موسم کی تاریخیں کونسی۔ کائنات کی دوسری بے شمار چیزوں کو چھوڑ کر اگر آدمی شب و روز کی اِس باقاعدگی ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھے اور کچھ دماغ کو سوچنے کی تکلیف بھی دے تو اسے اس امر کی شہادت ملے گی کہ یہ زبردست نظم و ضبط کسی قادرِ مطلق کا قائم کیا ہوا ہے اور اس کے قیام سے اُس مخلوق کی بے شمار مصلحتیں وابستہ ہیں جسے اُس نے اِس زمین پر پیدا کیا ہے۔ اب اگر ایسے حکیم و دانا اور قادر و توانا خالق کی دنیا میں رہنے والا کوئی شخص آخرت کی جزا و سزا کا انکار کرتا ہے تو وہ دو حماقتوں میں سے کسی ایک حماقت میں لامحالہ مبتلا ہے۔ یا تو وہ اُس کی قدرت کا منکر ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اِس کائنات کو ایسے بے نظیر نظم کے ساتھ پیدا کر دینے پر تو قادر ہے مگر انسان کو دوبارہ پیدا کر کے اُسے جزا و سزا دینے پر قادر نہیں ہے۔ یا وہ اُس کی حکمت و دانائی کا منکر ہے اور اس کے بارے میں یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اُس نے دنیا میں انسان کو عقل اور اختیارات دے کر پیدا تو کر دیا مگر وہ نہ تو اُس سے کبھی یہ حساب لے گا کہ اس نے اپنی عقل اور اپنے اختیارات سے کام کیا لیا، اور نہ اچھے کام کی جزا دے گا نہ بُرے کام کی سزا۔ اِن دونوں باتوں میں سے جس بات کا بھی کوئی شخص قائل ہو وہ پرلے درجے کا احمق ہے۔

لہ جزا و سزا پر شب و روز کے نظام سے استدلال کرنے کے بعد اب اُس کے ایک یقینی حقیقت ہونے پر انسانی تاریخ سے استدلال کیا جا رہا ہے۔ تاریخ کی چند معروف قوموں کے طرزِ عمل اور ان کے انجام کے ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے بہرے قانونِ فطرت پر نہیں چل رہی ہے بلکہ ایک خدائے حکیم اس کو چلا رہا ہے اور اُس خدا کی خدائی میں صرف ایک وہی قانون کارفرما نہیں ہے جسے تم قانونِ فطرت سمجھتے ہو، بلکہ ایک قانونِ اخلاق بھی کارفرما ہے جس کا لازمی تقاضا مکافاتِ عمل اور جزا و سزا ہے۔ اِس قانون کی کارفرمائی

کے آثار خود اس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہوتے رہتے ہیں جو عقل رکھنے والوں کو یہ بتاتے ہیں کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کیا ہے۔ یہاں جن قوموں نے بھی آخرت سے بے فکر اور خدا کی جزا و سزا سے بے خوف ہو کر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخر کار فاسد و مُفسد بن کر رہیں، اور جو قوم بھی اِس راستے پر چلی اُس پر کائنات کے رب نے آخر کار عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ انسانی تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ دو باتوں کی واضح شہادت دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت کا انکار ہر قوم کو بگاڑنے اور بالآخر تباہی کے غار میں دھکیل دینے کا موجب ہوتا ہے اس لیے آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے جس سے ٹکرانے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہر حقیقت سے ٹکرانے کا ہُوا کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جزائے اعمال کسی وقت مکمل طور پر بھی واقع ہونے والی ہے، کیونکہ فساد کی آخری حد پر پہنچ کر عذاب کا کوڑا جن لوگوں پر برسا اُن سے پہلے صدیوں تک بہت سے لوگ اُس فساد کے بیج بو کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور اُن پر کوئی عذاب نہ آیا تھا۔ خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی وقت اُن سب کی باز پُرس بھی ہو اور وہ بھی اپنے کیے کی سزا پائیں۔ (قرآن مجید میں آخرت پر یہ تاریخی اور اخلاقی استدلال جگہ جگہ کیا گیا ہے اور ہم نے ہر جگہ اُس کی تشریح کی ہے۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵-۶۔ یونس، حاشیہ ۱۲۔ ہود، حواشی ۵۷-۱۰۵-۱۱۵۔ ابراہیم، حاشیہ ۹۔ جلد سوم، النمل، حواشی ۸۶-۶۶۔ الروم، حاشیہ ۸۔ جلد چہارم، سبا، حاشیہ ۲۵۔ صٓ، حواشی ۲۹-۳۰۔ المومن، حاشیہ ۸۰۔ الدخان، حواشی ۳۳-۳۴۔ الجاثیہ، حواشی ۲۷-۲۸۔ جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۱۔ الذاریات، حاشیہ ۲۱)

۵ عادِ اِرَم سے مراد وہ قدیم قومِ عاد ہے جسے قرآنِ مجید اور تاریخِ عرب میں عادِ اولیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ سورۂ نجم میں فرمایا گیا ہے کہ وَاَنَّهٗٓ اَهۡلَكَ عَادَاۨ الۡاُوۡلٰى (آیت ۵۰) "اور یہ کہ اُس نے قدیم قومِ عاد کو ہلاک کیا"، یعنی اُس قومِ عاد کو جس کی طرف حضرت ہودؑ بھیجے گئے تھے اور جس پر عذاب نازل ہُوا تھا۔ اُس کے مقابلہ میں تاریخِ عرب اِس قوم کے اُن لوگوں کو جو عذاب سے بچ کر بعد میں پھلے پھولے تھے عادِ اُخریٰ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ قدیم قومِ عاد کو عادِ اِرَم اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اُس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو اِرَم بن سام بن نوح علیہ السلام سے چلی تھی۔ اِسی شاخ کی کئی دوسری ضمنی شاخیں تاریخ میں مشہور ہیں جن میں سے ایک ثمود ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور دوسرے آرامی (ARAMAEANS) ہیں جو ابتداءً شام کے شمالی علاقوں میں آباد تھے اور جن کی زبان آرامی (ARAMAIC) سامی زبانوں میں بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔

عاد کے لیے ذات العماد (اونچے ستونوں والے) کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ وہ بڑی

مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟[۴] اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟[۵] اور میخوں والے فرعون[۶] کے ساتھ؟ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور اُن میں بہت فساد پھیلایا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔

بڑی بلند عمارتیں بناتے تھے اور دنیا میں اُونچے ستونوں پر عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے اُنہی نے شروع کیا تھا۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ اُن کی اس خصوصیت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ حضرت ہودؑ نے اُن سے فرمایا اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ "یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے" (الشعراء، آیات ۱۲۸-۱۲۹)۔

[۴] یعنی وہ اپنے زمانے کی ایک بے نظیر قوم تھے، اپنی قوت اور شان و شوکت کے اعتبار سے کوئی قوم اُس وقت دنیا میں اُن کی ٹکر کی نہ تھی۔ قرآن میں دوسرے مقامات پر اُن کے متعلق فرمایا گیا ہے وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً "تم کو جسمانی ساخت میں خوب تنومند کیا" (الاعراف، آیت ۶۹)۔ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً "رہے عاد تو انہوں نے زمین میں کسی حق کے بغیر اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور کہنے لگے کون ہے ہم سے زیادہ زور آور؟" (حٰم السجدہ، آیت ۱۵)۔ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ "اور تم نے جب کسی پر ہاتھ ڈالا جبّارین کر ڈالا" (الشعراء، آیت ۱۳۰)۔

[۵] وادی سے مراد وادی القریٰ ہے جہاں اِس قوم نے پہاڑوں کو تراش تراش کر اُن کے اندر عمارتیں بنائی تھیں اور غالباً تاریخ میں وہ پہلی قوم ہے جس نے چٹانوں کے اندر اِس طرح کی عمارتیں بنانے کا سلسلہ شروع کیا تھا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۷-۵۹۔ الحجر، حاشیہ ۴۵۔ جلد سوم، الشعراء، حواشی ۹۵-۹۹ مع تصاویر)۔

[۶] فرعون کے لیے ذُوالْاَوْتَاد (میخوں والا) کے الفاظ اس سے پہلے سُورۂ ص آیت ۱۲ میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اِس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُس کی فوجوں کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو اور میخوں والا کا مطلب فوجوں والا ہو، کیونکہ انہی کی بدولت اُس کی سلطنت اس طرح جمی ہوئی تھی جیسے خیمہ میخوں کے ذریعہ سے مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد فوجوں کی کثرت ہو اور مطلب یہ ہو کہ اس کے لشکر جہاں بھی جا کر ٹھیرتے تھے وہاں ہر طرف ان کے خیموں کی میخیں ہی میخیں ٹھکی نظر آتی تھیں

حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے[۵]۔

مگر[۶] انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا[۹]۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ میخیں ہوں جن سے ٹھونک کر وہ لوگوں کو عذاب دیتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اہرام مصر کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو کیونکہ وہ فراعنہ کی عظمت و شوکت کے وہ آثار ہیں جو صدیوں سے زمین پر جمے کھڑے ہیں۔

۷ ظالموں اور مفسدوں کی حرکات پر نگاہ رکھنے کے لیے گھات لگائے ہوئے ہونے کے الفاظ تمثیلی استعارے کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ گھات اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی شخص کسی کے انتظار میں اس غرض کے لیے چھپا بیٹھا ہوتا ہے کہ جب وہ زد پر آئے اُسی وقت اس پر حملہ کر دے۔ وہ جس کے انتظار میں بیٹھا ہوتا ہے اُسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اُس کی خبر لینے کے لیے کون کہاں چھپا ہوا ہے۔ انجام سے غافل، بے فکری کے ساتھ وہ اس مقام سے گزرتا ہے اور اچانک شکار ہو جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اُن ظالموں کی ہے جو دنیا میں فساد کا طوفان برپا کیے رکھتے ہیں۔ انہیں اِس کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ خدا بھی کوئی ہے جو اُن کی حرکات کو دیکھ رہا ہے۔ وہ پوری بے خوفی کے ساتھ روز بروز زیادہ سے زیادہ شرارتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ حد آجاتی ہے جس سے آگے اللہ تعالیٰ انہیں بڑھنے نہیں دینا چاہتا اُسی وقت اُن پر اچانک اُس کے عذاب کا کوڑا برس جاتا ہے۔

۸ اب لوگوں کی عام اخلاقی حالت پر تنقید کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی زندگی میں یہ رویہ جن انسانوں نے اختیار کر رکھا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اُن سے کبھی باز پرس نہ ہو، اور اِس بات کو عقل و اخلاق کا تقاضا کیسے مانا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کر کے جب انسان دنیا سے رخصت ہو جائے تو اُسے کسی جزا اور سزا سے سابقہ پیش نہ آئے۔

۹ یعنی یہ ہے انسان کا مادہ پرستانہ نظریۂ حیات۔ اِسی دنیا کے مال و دولت اور جاہ و اقتدار کو وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔ یہ چیز ملے تو پھول جاتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا نے مجھے عزت دار بنا دیا، اور یہ نہ ملے تو کہتا ہے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا۔ گویا عزت اور ذلت کا معیار اس کے نزدیک مال و دولت اور جاہ و اقتدا

ہرگز نہیں،[۱۰] بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے[۱۱] اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اُکساتے[۱۲]، اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو[۱۳]، اور مال کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو[۱۴]۔ ہرگز نہیں،[۱۵] جب زمین پے در پے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی، اور تمہارا رب جلوہ فرما

کا ملنا یا نہ ملنا ہے، حالانکہ اصل حقیقت جسے وہ نہیں سمجھتا یہ ہے کہ اللہ نے جس کو دنیا میں جو کچھ بھی دیا ہے آزمائش کے لیے دیا ہے۔ دولت اور طاقت دی ہے تو امتحان کے لیے دی ہے کہ وہ اُسے پاکر شکر گزار بنتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ مفلس اور تنگ حال بنایا ہے تو اس میں بھی اُس کا امتحان ہے کہ صبر اور قناعت کے ساتھ راضی برضا رہتا ہے اور جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی مشکلات کا مقابلہ کرتا ہے، یا اخلاق و دیانت کی ہر حد کو پھاند جانے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اپنے خدا کو کوسنے لگتا ہے۔

[۱۰] یعنی یہ عزت اور ذلت کا معیار ہرگز نہیں ہے۔ تم سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اخلاق کی بھلائی اور بُرائی کے بجائے تم نے اسے معیارِ عزت و ذلت بنا رکھا ہے۔

[۱۱] یعنی جب تک اُس کا باپ زندہ رہتا ہے، اُس کے ساتھ تمہارا برتاؤ کچھ اور ہوتا ہے اور جب اُس کا باپ مر جاتا ہے تو ہمسائے اور دُور کے رشتہ دار تو درکنار چچا اور ماموں اور بڑے بھائی تک اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

[۱۲] یعنی تمہارے معاشرے میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا کوئی چرچا نہیں ہے۔ نہ کوئی خود کسی بھوکے کو کھانا کھلانے پر آمادہ ہوتا ہے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک مٹانے کے لیے کوئی فکر کریں اور ایک دوسرے کو اس کا انتظام کرنے پر اُکسائیں۔

[۱۳] عرب میں عورتوں اور بچوں کو تو میراث سے ویسے ہی محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظریہ اس باب میں یہ تھا کہ میراث کا حق صرف اُن مردوں کو پہنچتا ہے جو لڑنے اور کنبے کی حفاظت کرنے کے قابل ہوں۔ اس کے علاوہ مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقتور اور با اثر ہوتا تھا وہ بلا تامل ساری میراث سمیٹ لیتا تھا اور اُن سب لوگوں کا حصہ مار کھاتا تھا جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بوتا نہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی اہمیت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دیں خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

[۱۴] یعنی جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمہیں کوئی فکر نہیں۔ جس طریقے سے بھی مال حاصل کیا جا سکتا ہے

ہوگا۱۶ اُس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہونگے، اور جہنم اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اُس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟۱۷ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اِس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا! پھر اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں، اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔

(دوسری طرف ارشاد ہوگا) اے نفسِ مطمئن۱۸، چل اپنے رب کی طرف۱۹ اِس حال میں کہ تو (اپنے انجامِ نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں

اسے حاصل کرنے میں تمہیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اور خواہ کتنا ہی مال مل جائے تمہاری حرص و طمع کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔

۱۵ یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ تم دنیا میں جیتے جی یہ سب کچھ کرتے رہو اور اِس کی بازپرس کا وقت کبھی نہ آئے۔ جس جزا و سزا کا انکار کر کے تم نے زندگی کا یہ ہنجار اختیار کر رکھا ہے وہ کوئی اَنہونی اور خیالی بات نہیں ہے بلکہ وہ پیش آنی ہے اور اُس وقت آنی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

۱۶ اصل الفاظ ہیں جَاءَ رَبُّكَ جن کا لفظی ترجمہ ہے "تیرا رب آئے گا" لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے لامحالہ اِس کو ایک تمثیلی اندازِ بیان ہی سمجھنا ہوگا جس سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اِس کی سلطانی و قہاری کے آثار اُسی طرح ظاہر ہونگے جیسے دنیا میں کسی بادشاہ کے تمام لشکروں اور اعیانِ سلطنت کی آمد سے وہ رعب طاری نہیں ہوتا جو بادشاہ کے بنفسِ نفیس خود دربار میں آجانے سے طاری ہوتا ہے۔

۱۷ اصل الفاظ ہیں يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى۔ اِس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اُس روز انسان یاد کرے گا کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہے اور اِس پر نادم ہوگا، مگر اس وقت یاد کرنے اور نادم ہونے کا کیا فائدہ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اُس روز انسان کو ہوش آئے گا، اُسے نصیحت حاصل ہوگی، اُس کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ جو کچھ اُسے انبیاء نے بتایا تھا وہی صحیح تھا اور اُن کی بات نہ مان کر اُس نے حماقت کی، مگر اُس وقت ہوش میں آنے اور نصیحت پکڑنے اور اپنی غلطی کو سمجھنے کا کیا فائدہ۔

۱۸ نفسِ مطمئن سے مراد وہ انسان ہے جس نے کسی شک و شبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے

ع۱ میں اور داخل ہو جا میری جنت میں ؏

دل کے ساتھ اللہ وحدہٗ لاشریک کو اپنا رب اور انبیاء کے لائے ہوئے دینِ حق کو اپنا دین قرار دیا، جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسول سے ملا اُسے سراسر حق مانا، جس چیز سے بھی اللہ کے دین نے منع کیا اُس سے بادلِ ناخواستہ نہیں بلکہ اِس یقین کے ساتھ رک گیا کہ فی الواقع وہ بُری چیز ہے جس قربانی کی بھی حق پرستی کی راہ میں ضرورت پیش آئی بے دریغ اسے پیش کر دیا، جن مشکلات اور تکالیف اور مصائب سے بھی اِس راہ میں سابقہ درپیش ہوا انہیں پُورے سکونِ قلب کے ساتھ برداشت کیا، اور دوسرے راستوں پر چلنے والوں کو دنیا میں جو فوائد اور منافع اور لذائذ حاصل ہوتے نظر آرہے تھے ان سے محروم رہ جانے پر اُسے کوئی حسرت لاحق نہ ہوئی بلکہ وہ اِس بات پر پوُری طرح مطمئن رہا کہ دینِ حق کی پیروی نے اُسے اِن گندگیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ اِسی کیفیت کو دوسری جگہ قرآن میں شرحِ صدر سے تعبیر کیا گیا ہے (الانعام، آیت ۱۲۵)۔

۱۹ یہ بات اُس سے موت کے وقت بھی کہی جائے گی، قیامت کے روز جب وہ دوبارہ اُٹھ کر میدانِ حشر کی طرف چلے گا اس وقت بھی کہی جائے گی، اور جب اللہ کی عدالت میں پیشی کا موقع آئے گا اُس وقت بھی کہی جائے گی۔ ہر مرحلے پر اسے اطمینان دلایا جائے گا کہ وہ اللہ کی رحمت کی طرف جا رہا ہے۔

اسلام کا شورائی نظام

از: ڈاکٹر حسن ہویدی — تلخیص و ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ج وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ج (آل عمران)

اللہ کی رحمت کے سبب تم اُن سے نرمی سے پیش آئے اگر آپ تندرو اور سخت دل ہوتے تو وہ آپ کو چھوڑ کر چلے جاتے ان سے درگذر کر اور انہیں معاف کر دے اور ان سے مشورہ کر۔

اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر مومنین کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ص وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ - (الشوریٰ ۳۷)

یہ وہ لوگ ہیں جو باری تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اور باہمی معاملات صلاح مشورے سے حل کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اُسے خرچ کرتے ہیں۔

جن معاملات میں وحی سے رہنمائی نہیں مل سکتی اور جن کے بارے میں سُنّتِ رسول بھی خاموش ہے اُن کے لیے اسلام نے مشاورت کا حکم دیا ہے۔ اور اسے نظامِ زندگی کی اساس ٹھیرایا ہے اور مسلمانوں کو اس سے استفادہ کی ترغیب دی ہے۔ اللہ کے جن بندوں نے اس نظام کو اپنانے کی کوشش کی ہے قرآن مجید نے ان کی مدح و توصیف فرمائی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جلیل القدر خلفاء نے اس پر عمل پیرا ہو کر اس کے خطوط متعین کیے اور ان کے بعد صحابہ اور دوسرے اہلِ حق اس راستہ پر گامزن رہے۔ انہوں نے اس نظامِ شورائیت میں گوناگوں فوائد دیکھے۔ یہ وہ نظام ہے جس میں مختلف آرا سامنے آجاتی ہیں اور پھر دلائل کے ذریعے بات کی جاتی ہے اور اس طرح پوری چھان پھٹک

کے بعد صحیح چیز کو اخذ کیا جاتا ہے۔ امام لبغوی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی ہے

مارأیت رجلا اکثر استشارۃً للرجال من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

میں نے انسانوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشورہ کرنے والا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔

جب یہ طرزِ عمل اس ذاتِ اقدس کا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے وحی سے سرفراز فرما کر لوگوں کی آراء اور مشوروں سے بے نیاز کر رکھا ہے تو کیا وجہ ہے کہ دوسروں کو مشاورت کی بدرجہ اتم ضرورت محسوس نہ ہو۔ مشاورت کی افادیت پر بہت سے دوسرے علماء اور حکماء نے بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ مشاورت عین ہدایت ہے۔ جس شخص نے اپنے آپ کو دوسروں کے مشورے سے بے نیاز سمجھا، اُس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال لی۔ عمل سے پہلے تدبر کرنے والا ندامت اور پچھتاوے سے بچ جاتا ہے۔ بعض حکماء نے یہ بھی کہا ہے کہ صحیح اور درست بات معلوم کرنے کے لیے مشاورت سے بہتر کوئی دوسری تدبیر نہیں۔ جب کوئی شخص کسی کام کا ارادہ کرے تو اُسے چاہیے کہ وہ اس بارے میں دوسروں سے مشورہ لے۔ تو اس مشورے میں اس پر صحیح بات واضح ہو جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اکیلا کسی مسئلے کے سارے بہتر پہلوؤں کا اچھی طرح احاطہ نہیں کر سکتا۔ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں مشاورت ہی سے صحیح ترین امور کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ ابنِ عربی نے کہا ہے، مشاورت سے جماعت کے اندر الفت و محبت پیدا ہوتی ہے اور لوگوں کے عقلی معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ مشاورت اس قدر اہم چیز ہے کہ اس سے کوئی امیر، کوئی قائد، کوئی حاکم، کوئی عالم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مشاورت کے سلسلے میں شریعت نے جو احکام صادر کیے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:

(۱) علماء کرام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ہدایات دی ہیں ان کے بارے میں وہ مشورہ کرنے کے مجاز نہیں۔

(۲) علماء کا البتہ اس امر میں اختلاف ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنی کسی معاملے کے طے کرنے میں ان سے مشورہ کرو" کیا یہ حکم واجب ہے یا محض اجر و ثواب کا موجب۔ ابنِ کثیرؒ اپنی تفسیر جلد (۲)، صفحہ ۱۴۲ میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فقہاء کا اس معاملے میں اختلاف ہے کہ کیا محض مندرجہ بالا آیت کی رُو سے مشاورت کی نوعیت واجب کی ہے یا محض اجر و ثواب کی۔ امام قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں اس پر اظہارِ خیال کیا ہے انہوں نے لکھا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ بعض معاملات میں اجتہاد اور وحی الٰہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے قیاس سے کام لینے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا حکم دیا ہے۔ البتہ اس حکم کے دائرۂ اثر کے بارے میں اختلاف ہے۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس مشاورت کا دائرہ جنگی چالوں، دشمن کے ساتھ مقابلے تک محدود ہے۔ مشاورت سے حضورؐ کے صحابہ کی دل جوئی اور ان کی قدر و منزلت اور دینی معاملات میں ان کی تربیت مقصود تھی۔ درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو وحی کے ذریعے ان کی رائے سے مستغنی کر رکھا تھا۔

یہ خیال قتادہؒ، ربیعؒ، ابن اسحاقؒ اور امام شافعیؒ کا ہے۔ امام شافعیؒ نے بطور مثال حضورؐ کا ایک قول نقل فرمایا ہے کہ جب کسی کنواری سے نکاح کے وقت اجازت طلب کی جاتی ہے تو اس میں مشاورت واجب کے حکم میں نہیں آتی۔ بلکہ اس کا مقصد اس خاتون کی دل جوئی ہوتا ہے۔ دوسرے گروہ جن میں حسن بصریؒ اور ضحاک ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاورت کا جو حکم دیا ہے۔ اُس کی وجہ کچھ یہ نہیں کہ حضورؐ اپنے صحابہ کی رائے کے محتاج تھے، بلکہ اس میں مصلحتِ خداوندی یہ تھی کہ اللہ اس کے ذریعہ مشاورت کی خوبیاں ظاہر کرنا چاہتا تھا تاکہ حضورؐ کی امت بعد میں اس پر عمل پیرا ہے

(۳) علماء سلف و خلف اس بات پر متفق ہیں کہ خلیفہ یا امیر کو جب حق کے معاملے میں شرحِ صدر حاصل ہو جائے تو اس کے لیے مشاورت ضروری نہیں۔

ہم آگے بڑھنے سے پہلے چند باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔

(ا) جہاں تک نص صریح کا تعلق ہے خواہ اس کی اساس قرآن مجید ہو یا سنتِ رسول اس پر اجتہاد نہیں ہو سکتا۔

(ب) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت شارع کی ہے۔ حضورؐ نے اپنے قول، فعل اور عمل سے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ عین شریعت ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ امت اس کی پیروی کرے (اب مشاورت کے بارے میں حضورؐ کا عمل) اس بات کے لیے دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا کہ یہ عمل صرف حضورؐ کی زندگی تک ہی واجب الاتباع تھا۔

(ج) ایک ایسی نص جو مختلف تعبیرات کی حامل ہو وہ اجتہاد کا موضوع بن سکتی ہے اور اس لیے اس کے بارے میں مشاورت کی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں اگر امیر اس نص کی ایک خاص تعبیر کرے

اور اس امر پر اصرار کرے کہ چونکہ اس کے موقف کی بنیاد نص پر ہے اس لیے اس کے متعلق مشاورت نہیں ہو سکتی تو یہ دعویٰ صحیح نہیں کیونکہ صرف نصِ صریح مشاورت سے بالا ہے جس میں کوئی ایسا حکم قطعی موجود ہو جس کی ایک تعبیر کے علاوہ دوسری تعبیر نہ کی جاسکتی ہو۔

(د) خلیفہ وقت کا کسی مرحلے میں اپنی رائے سے رجوع کر کے شوریٰ کے ارکان کی رائے کو اختیار کر لینا اس بات کی دلیل نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ شوریٰ کا فیصلہ حتمی اور قطعی ہوتا ہے۔ خلیفہ یا کسی دوسرے شخص پر صرف قبولِ حق کی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔ خواہ وہ کہیں سے بھی ملے۔ تاریخ میں ہمیں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جو فی الحقیقت مشاورت کے ہی ثمرات ہیں جن میں کبھی خلیفہ نے ارکانِ شوریٰ کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر ان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ خلیفہ کے لیے شوریٰ محض ایک اضافی ادارہ ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں

مندرجہ بالا بنیادی امور کے تذکرے کے بعد ہم سب سے پہلے ان واقعات کا ذکر کرتے ہیں جن سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ خلیفہ شوریٰ کے فیصلے کا ہر حال میں پابند نہیں۔

اس مضمون کے آغاز میں سورۃ آلِ عمران اور سورۃ الشوریٰ کی جو آیات نقل کی گئی ہیں ان میں کسی سے بھی یہ استنباط نہیں کیا جاسکتا کہ خلیفہ شوریٰ کی رائے کا پابند ہے بلکہ اس استنباط کے برعکس ہم پہلی سورۃ میں تو یہ دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھیوں کے لیے باری تعالیٰ سے طلبِ عفو و غفران کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں یہ بات کیونکر قرینِ قیاس ہو سکتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن لوگوں کی آراء کا پابند بنایا جائے جو اس بات کے محتاج ہیں کہ نبی اُن کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت و معافی طلب کرے۔ جس ذات کا مقام ارفع و اعلیٰ ہو اُسے نسبتاً کم تر مقام رکھنے والے لوگوں کی رائے کا کس طرح محتاج ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مفسّرین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشاورت کو صحابہ کی دلجوئی پر محمول کیا ہے اور اس کا مقصد وحید یہ قرار دیا ہے کہ حضورؐ کے بعد امت کس طرح اس پر عمل پیرا رہے۔ پھر سورۃ الشوریٰ کی آیت کا یہ حصہ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ، یعنی جب تو عزم کر لے تو پھر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے (کام کو شروع کر دے)، اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے کہ مشاورت کے باوجود حضورؐ اپنی رائے پر قائم رہے یا دوسرے لفظوں میں حضورؐ نے جو رائے قائم کی اسی پر عمل کیا اور جن لوگوں سے مشاورت کی تھی اپنی رائے کو ان کا پابند نہیں بنایا۔ اگر مندرجہ بالا آیت سے شوریٰ کے فیصلے کا وجوب ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ تو اس سے یہ بات بھی نہیں نکلتی کہ شوریٰ

محض ثانوی ادارہ ہے سلف و خلف میں کوئی عالم بھی شوریٰ کی رائے کے وجوب کا قائل نہیں (البتہ اس کی غیر معمولی افادیت کے سب قائل ہیں)، اپنے اس موقف کی تائید میں انہوں نے جن واقعات سے استشہاد کیا ہے وہ چند ایک یہ ہیں۔

صلح حُدَیبیہ: ابن کثیر نے اپنی تفسیر جلد چار ص۱۹۷ میں صحیح بخاری سے اس واقعہ کو یوں نقل فرمایا ہے۔

سُہیل بن عمرو (کفار کا وکیل) آیا اور کہا لو معاہدہ تحریر کرو۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھو۔ اس پر سہیل نے کہا۔ خدا کی قسم مَیں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے بلکہ باسمک اللّٰہم لکھو جو (پہلے) لکھا جاتا تھا۔ اس پر مسلمانوں نے کہا خدا کی قسم ہم سوائے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اور کچھ نہ لکھیں گے مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ہاں باسمک اللّٰہم ہی لکھیے پھر حضورؐ نے فرمایا "یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ اور قریش کے مابین ہوا ہے" اس پر سہیل نے کہا: خدا کی قسم! اگر ہم یہ تسلیم کرتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ کی زیارت سے کیوں روکتے اور ہم آپ کے خلاف صف آرا کیوں ہوتے، اس لیے صرف محمد بن عبداللہ لکھو۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم میں اللہ کا رسول ہوں اگرچہ تم مجھے جھٹلا رہے ہو، چلو محمد ابن عبداللہ ہی لکھو۔ پھر سہیل نے کہا: اگر تمہارے پاس ہمارا کوئی آدمی آجائے تو خواہ وہ تمہارا دین قبول ہی کر چکا ہو، اُسے ہماری طرف لوٹانا پڑے گا۔

اس پر مسلمانوں نے کہا سبحان اللہ وہ مشرکین کی طرف کس طرح لوٹایا جا سکتا ہے، درآنحالیکہ وہ مسلمان ہو گیا ہو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدے کو لکھوا کر فارغ ہوئے تو آپ نے صحابہؓ سے فرمایا: اٹھو جانوروں کی قربانی کرو۔ اور بالوں کو منڈواؤ۔ راوی کا بیان ہے کہ خدا کی قسم کوئی شخص بھی کھڑا نہ ہوا یہاں تک کہ حضورؐ کو یہ فرمان تین مرتبہ دُہرانا پڑا۔

یہ واقعہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثریت بلکہ قریب قریب سارے مسلمانوں کی رائے کے مخالف فیصلہ صادر فرمایا۔ مسلمانوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم سوائے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کے اور کچھ نہ لکھیں گے مگر حضور سرورِ دو عالمؐ نے باسمک اللّٰھم لکھنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں کا موقف یہ تھا کہ جو شخص ان کے پاس مسلمانوں کی حیثیت سے آتا ہے اسے مشرکین کو کس طرح لوٹایا جا سکتا ہے مگر حضورؐ نے مسلمانوں کے اس موقف کی تائید نہ کی بلکہ مشرکین کے مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ پھر حضور سرورِ دو عالمؐ نے انہیں قربانی کرنے اور سر منڈانے کا حکم دیا مگر کوئی شخص ان کاموں کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ قصہ مختصر حضورؐ نے اس معاہدے میں ایسی شرائط منظور کیں جن میں بظاہر مسلمانوں کی ہیٹی تھی۔

صلح حدیبیہ کے یہ سارے گوشے اس امر کی شہادت فراہم کرتے ہیں کہ قائد کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ جس چیز کو صحیح سمجھتا ہے اسے اکثریت کی رائے کے علی الرغم اختیار کرے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شوریٰ کا فیصلہ امیر کے لیے قطعی اور حتمی نہیں ہوتا کیونکہ حضورؐ نے ہمیں اس ضمن میں جو رہنمائی دی ہے وہ بحیثیت شارع کے دی ہے۔ اگر کوئی شخص اس پر یہ اعتراض کرے کہ حضورؐ نے یہ فیصلہ وحی کی بنیاد پر کیا اس لیے وہ دوسروں کی رائے سے بے نیاز تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ کیونکہ سورۃ الفتح جو اس واقعہ سے بحث کرتی ہے یہ اس وقت نازل ہوئی جب حضورؐ قافلے سمیت مدینہ واپس تشریف لے جا رہے تھے۔ اگر حضورؐ یہ احکام وحی کی بنیاد پر دیتے تو آخر کوئی مسلمان وحی کے مخالف کس طرح کوئی قدم اٹھانے کی جسارت کر سکتا تھا کیونکہ وحی کی جانتے بوجھتے مخالفت کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے اور یہ لوگ جن کے بارے میں قرآن مجید نے یہ کہا ہے کس طرح احکام الٰہی کے خلاف طرزِ عمل اختیار کر سکتے تھے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (النور۔ ۵۱)	ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔

پھر اس سلسلے میں کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے محفوظ و مامون کر رکھا تھا اور وہ فطری طور سے صحیح بات کو اخذ کرنے پر مجبور تھے۔ مگر باقی افراد کے ساتھ یہ صورت ممکن نہیں۔ یہ سرورِ عالمؐ کا خصوصی امتیاز تھا جس کی بنا پر وہ دوسروں سے منفرد تھے ہم اس بات کو نہ صرف مانتے ہیں بلکہ اسے اپنا جزوِ ایمان بھی سمجھتے ہیں مگر حضورؐ کا شوریٰ کے معاملے میں یہ

طرزِ عمل ایسا نہیں جو صرف اُن کی ذات تک محدود ہو بلکہ یہ تو شرعی حکم ہے جس کی امت کو اطاعت اور پیروی کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ حضورؐ تو سورۃ النجم کی آیت ۳ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی کے مطابق کوئی بات بھی اپنی مرضی سے نہیں کہتے تھے۔ بلکہ وہی فرماتے اور کرتے جن کے لیے اللہ تعالیٰ اُنھیں وحی کی صورت میں حکم دیتا۔ خواہ یہ وحی متلو ہوتی یا غیر متلو تو اس دلیل سے شوریٰ کی رائے کا وجوب تو ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات شوریٰ کے فیصلے کے خلاف عمل کیا جو اصل میں حکمِ خداوندی تھا۔ اس لیے حضورؐ کی پیروی میں دینی مصالح کے تحت خلیفہ اور امیر بوقتِ ضرورت شوریٰ کے فیصلے کو نظر انداز کرنے کا مجاز ہے۔ اگر ہم شوریٰ کے معاملے میں ہدایت اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سُنت سے حاصل نہ کریں گے تو آخر کس سے کریں گے؟

صلح حدیبیہ کا یہ مشہور واقعہ خلیفہ کے لیے اور امیر کے لیے ارکانِ شوریٰ کے فیصلے سے ہٹ کر عمل کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے بشرطیکہ خلیفہ کے سامنے حق و صداقت کی وہ راہ واضح ہو جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو۔ یہ وہ طرزِ عمل تھا جسے حضور کے بعد خلفاءِ راشدین نے اختیار کیا۔ جب بھی اللہ کے دین کی حفاظت مقصود ہو تو خلیفہ اگر محسوس کرے کہ شوریٰ کا فیصلہ صحیح نہیں تو اُسے پسِ پُشت ڈال سکتا ہے۔ ہم یہاں جنگِ اُحد کو شوریٰ کے فیصلے کے عدمِ وجوب پر بطورِ شہادت پیش نہیں کرنا چاہتے۔ ہم پہلے ہی یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ امام اپنی رائے تبدیل کر کے اپنے رفقاء کار کی رائے قبول کر سکتا ہے۔ اور اس میں کوئی چیز بھی مانع نہیں مگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ رائے کی یہ تبدیلی محض اُن کی رائے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ان کی رائے صحیح اور درست ہے۔ اصل میں تو رجوع حق و صداقت کی طرف کیا جاتا ہے خواہ وہ کسی جگہ بھی ہو۔ کس قدر فرق ہے رجوع الی الحق اور دوسرے لوگوں کی رائے کی پابندی میں جبکہ حق اس کا مؤید نہ ہو؟

اس سلسلے میں مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جنگ بھی ہمارے اس موقف کی تائید کرتی ہے کہ خلیفہ اکثریت کی رائے کو نظر انداز کر کے ایک ایسا قدم اٹھا سکتا ہے جو حق کے زیادہ قریب ہو۔

العواصم من القواصم کے صفحہ ۴۶ پر مذکور ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہؓ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کی۔ اگر اس وقت عرب کے بعض قبائل، نے آپ کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے تو (موجودہ حالات) میں آپ کو صبر کرنا چاہیے۔ اس پر آپ نے فرمایا:

"خدا کی قسم! اگر کوئی اونٹ کے پاؤں باندھنے کی رسی دینے سے بھی (پس و پیش کریگا جو وہ پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زکوٰۃ کی صورت میں دیتا تھا۔ تو میں ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کروں گا۔ میں ان کے خلاف صف آرا ہوں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے مابین تفریق کرتے ہیں۔ اس پر انہیں کہا گیا ہ کسے ساتھ لے کر آپ ان سے جنگ کریں گے؟ تو آپ نے کہا" اکیلا ہی (اگر مجھے ایسا کرنا پڑا)"۔

آپ غور کریں کہ کس طرح خلیفہ اپنی رائے میں منفرد ہونے کے باوجود وثوق کے ساتھ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کرنے پر اصرار کر رہا ہے اور اس راہ میں تن تنہا لڑنے کا عزم بالجزم رکھتا ہے۔ اس مثال کے ہوتے ہوئے کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلیفہ پر شوریٰ کے فیصلے کی پابندی لازم ہے۔ اور اگر ان لوگوں کا دعویٰ صحیح ہے تو کیا حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسا جلیل القدر انسان اور خلیفہ راشد شوریٰ کے فیصلے کو پس پشت ڈالنے کی غلطی کر سکتا ہے؟ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل میں ہمارے لیے رہنمائی کا کوئی سامان موجود نہیں ہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان حضرات کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے "میرے بعد میری سنت اور خلفائے راشدین کے طریقے کی پیروی لازم ہے"۔ اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے خلیفہ راشد کا طرز عمل واجب الاتباع نہیں ہو سکتا تو اور کس کا ہو سکتا ہے؟ اگر اس ضمن میں کوئی یہ کہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس وقت تک جنگ نہ کی جب تک کہ دوسرے صحابہ جن میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے ان کی رائے سے متفق نہ ہو گئے۔ اور انہوں نے ان کی رائے کی صحت کا واضح طور پر یوں اعتراف نہ کیا کہ "میں نے یہ دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے مانعین زکوٰۃ کے معاملے میں حضرت ابوبکرؓ کا سینہ کھول دیا ہے۔ اور میں نے اس حقیقت کو پہچان لیا ہے کہ وہ حق پر ہیں"۔ اگر یہ دلیل بھی پیش کی جائے تو اس سے آخر یہ نتیجہ کس طرح نکل سکتا ہے کہ خلیفہ اکثریت کی رائے کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سلسلے میں جو طرز عمل اختیار کیا اس کی بنیاد نص تھی تو اس سے بھی ارکان شوریٰ کی رائے

کا وجوب ثابت نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کے جس قول سے استشہاد کیا وہ یہ ہے :

أُمِرتُ أن أقاتل الناس حتّیٰ یشهدوا ان لا الٰه الا الله وان محمدا رسول الله فاذا قالوها عصموا منی دماءهم واموالهم الا بحقها۔

مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے خلاف جنگ کروں جب تک کہ وہ اس بات کی شہادت نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں جب وہ اس کا اعتراف کر لیں تو ان کی جانیں اور مال محفوظ ہیں۔

جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس نص سے استدلال فرمایا تو پھر اُن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آخر کیوں اختلاف کیا۔ یہ دونوں بزرگ اس بات کے قائل تھے کہ نص ان کے موقف کی تائید کرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ چونکہ اس نص سے دونوں پہلو نکلتے تھے اس لیے ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ حق اس کے ساتھ ہے۔ یہ ایک ایسی صورت تھی کہ جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر آئے ہیں کہ جب کسی نص سے کئی ایک پہلو نکل سکتے ہوں تو اس کے بارے میں اجتہاد و استنباط کیا جا سکتا ہے اور شوریٰ میں اس پر بحث کی جا سکتی ہے اور اس معاملے میں اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی جس طرح کہ نصِ قطعی میں کی جاتی ہے۔ اگر یہ نصِ قطعی ہوتی تو صحابہ کرام میں اس پر کوئی اختلاف نہ ہوتا اور ان سب کا موقف ایک ہی ہوتا۔ مگر چونکہ یہ نص قطعی نہ تھی اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش تھی اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حق واضح فرمایا جس کی بنا پر انہوں نے صحابہ کی رائے کے علی الرغم مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔

(باقی)

سوشلسٹوں کی تحریف فی القرآن

از جناب ریاض الحسن صاحب نوری

۱۹۶۵ء میں جب بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بغیر کسی اعلانِ جنگ کے ہندوستان نے پاکستان پر اچانک حملہ کر دیا تھا تو اس کے جواب میں سابق صدر نے کلمہ پڑھتے ہوئے افواجِ پاکستان کو جہاد کا حکم دیا تھا۔ تمام قوم نے اس وقت رجوع الی اللہ اختیار کیا۔ فلمی گانوں کی بجائے فضائیں حمد و نعت سے معمور ہو گئیں۔ اللہ سے گڑگڑا کر دعا کی گئی تو اللہ نے فتح و نصرت عطا فرمائی اور دشمن اپنی پانچ گنا طاقت اور امریکہ و روس کی پشت پناہی کے باوجود پسپا ہو گیا۔ تمام دنیا میں پاکستانی افواج کی دھاک بیٹھ گئی اور پاکستان کا نام بلند ہو گیا۔

مگر جب سے ہمارے ملک میں کچھ لیڈروں نے اسلام اور نظریۂ پاکستان سے منہ موڑ کر سوشلزم کا نعرہ بلند کیا ہے اور صوبائی عصبیت کو ہوا دینی شروع کی ہے اس وقت سے اس بے دین نعرہ کی بدولت میں پاکستان یکے بعد دیگرے مصیبت در مصیبت سے دوچار ہو رہا ہے۔ سوشلسٹ حکومتیں اور لیڈر غیر ممالک میں نفوذ کرتے اور وہاں اپنے ایجنٹ پیدا کر کے سوشلسٹ سامراج قائم کرنے کی نیت سے نعرہ لگاتے ہیں کہ تمام دنیا کے مزدور ایک ہیں۔ لیکن جن علاقوں پر ان کی حکومت کا قبضہ ہو جاتا ہے یا جس جگہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں وہاں صوبائی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں کو ہوا دینے لگتے ہیں۔ روسی ترکستان[1]

---

[1] یاد رہے کہ ترک مسلمانوں کے بطلِ حریت انور پاشا ماسکو گئے تھے اور سوشلسٹوں کی باتوں میں آکر روسی ترکستان میں کام کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ مگر جلد ان پر سوشلسٹوں کا فریب واضح ہو گیا اور وہ ان کے خلاف ہو گئے انہوں نے آخر کار روسی ترکستان کے مجاہدوں کی کمان کرتے ہوئے بالشویکوں کے ہاتھ سے جامِ شہادت نوش کیا۔ غرض ان کا خون بھی سوشلسٹوں کے سر ہے۔

کو چھوٹے چھوٹے علاقوں میں تقسیم کرکے وہاں معروف سامراجی پالیسی DIVIDE AND RULE پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو) کی پالیسی پر مسلسل عمل کیا جا رہا ہے۔

آج جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا ہے اس کا خطرہ قائد اعظم نے اپنے زمانے میں محسوس کر لیا تھا اور اس کے خلاف متنبہ بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں تین لاکھ کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

"میں بالکل صاف اور کھلے الفاظ میں آپ لوگوں کو بتاتا ہوں کہ آپ میں چند کمیونسٹ اور دیگر غیر ملکی ایجنٹ ہیں جو غیر ممالک سے مالی امداد حاصل کرتے ہیں اور اگر آپ محتاط نہ ہوئے تو آپ کو بدنامی کا داغ اٹھانا پڑے گا[۱]"

آج ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ہماری حکومتوں نے قائد اعظم کی اس نصیحت پر کان نہ دھرا۔ سوشلسٹوں کو سرکاری دفتروں، تعلیم گاہوں، اخباروں، ریڈیو، ٹیلیویژن ہر مقام پر کام کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ بلکہ ان کو دوسرے لوگوں پر فوقیت دی جاتی رہی۔ اس کے نتیجہ میں یہ حضرات اس سے بھی کہیں زیادہ کر گزرے جتنا کہ قائد اعظم کو خطرہ تھا۔ اسی تقریر میں انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "بھلا یہ کہنے کا کیا فائدہ ہے کہ ہم بنگالی یا سندھی یا پٹھان یا پنجابی ہیں؟ نہیں ہم مسلمان ہیں۔" یہ ایک حقیقت ہے کہ سوشلسٹ قائد اعظم کے نزدیک ہمیشہ مشکوک رہے ——— اب کچھ عرصہ سے سوشلسٹ حضرات پروپیگنڈے[۲]

---

[۱] P.485 SPEECHES AND WRITINGS OF MR. JINNAH VOL II PUBLISED BY (SH. (MUHAMMAD ASHRAF 1964

مزید ایک تقریر میں آپ نے کمیونسٹوں کو چالاک کہا اور بتایا کہ انہوں نے سرخ، روسی، کانگرسی، لیگی سب جھنڈے اپنا رکھے ہیں۔ جب ایک آدمی کے اتنے جھنڈے ہوں تو میں مشکوک ہو جاتا ہوں۔ اس پر سامعین نے قہقہہ لگایا (صفحہ ۵۹۱ جلد دوم)

[۲] بیڈن روڈ لاہور میں ایک بڑے پلاسٹک کے ٹکڑے پر یہ موضوع اور بے معنی حدیث آویزاں رہی کہ "کلمہ گو کو کافر کہنے والا خود کافر ہے۔" حالانکہ اصل حدیث یہ ہے کہ اذا قال الرجل لاخیہ یا کافر فقد باء بہ احدھما یعنی جو کسی مسلمان بھائی کو یا کافر کہہ کر پکارے تو بات ان میں سے ایک کی طرف لوٹ آئے گی۔ اس کی شرح میں ابن حجر نے لکھا ہے کہ اگر کہنے والا سچا ہوا تو پھر ٹھیک ہے ورنہ اگر جھوٹا ہے تو جھوٹ کا گناہ کہنے والے پر لوٹ آئے گا جھوٹا الزام عائد کرنے کی وجہ سے اسے جھوٹ کا گناہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ وہ کافر بن جائے گا۔ اور یہی بات عقلاً بھی واضح ہے۔

ہیں اس قدر بے باک اور شرم وحیا سے عاری ہو چکے ہیں کہ انہوں نے جھوٹی احادیث گھڑنے اور قرآنی آیات کے ترجموں میں تحریف کا آغاز کر دیا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ قرآن میں معنوی تحریف سے جتنا صدمہ ہمیں پہنچا ہے اتنا ہی ہر مسلمان کو پہنچا ہوگا۔ چاہے وہ عوام الناس میں سے ہو یا عساکر پاکستان میں سے ہو یا سرکاری ملازمین سے۔ کیونکہ مسلمان قرآن میں تحریف ہرگز نہیں برداشت کر سکتا۔ جب اصل آیات نہ دی جائیں، اور صرف تحریف شدہ ترجمہ دے دیا جائے تو بات معنوی تحریف سے بڑھ کر لفظی تحریف کے دائرہ میں آجاتی ہے

۸ مئی ۱۹۷۱ء کو اشتراکیت کے علمبردار روزنامہ "مساوات" نے ایک بڑا پُرفریب اور شر انگیز اداریہ لکھا جس میں تمہید کے بعد بہت سی قرآنی آیات کا تحریف شدہ ترجمہ دیا گیا تھا۔ ہم اس اداریہ کا کچھ حصہ اور بطورِ نمونہ چند آیات پیش کرتے ہیں ورنہ تمام آیات کا ترجمہ تحریف شدہ ہے اور فساد پھیلانے کی غرض سے کیا گیا ہے۔ تمام سلف و خلف کو بُرا کہتے ہوئے مساوات اپنے اداریہ میں یُوں لکھتا ہے:

"قرآنی اسلام ہماری نظروں سے چھپا لیا گیا ہے اور حضورؐ کے کُلّی نظام کے تذکرے بھی اب صحت کے ساتھ کتابوں میں نہیں ملتے . . . . مگر حیف ہے کہ پیشہ ور مفسر اور سامراجی مولوی اس کی اصلاح کے لیے قرآنی تدابیر پر عمل کرنے کی بجائے اسی یورپی سرمایہ دارانہ نظام کو چند فروعی اور رسمی اصلاحات کے بعد عین اسلام قرار دیتے ہیں . . . . "

حضورؐ نے اقوام عالم کو جو سبق پڑھایا تھا اس کے مطابق اسلام ایک کُلّی اور مکمل اجتماعی ضابطہ ہے جس کی مستقل اقدار قرآن کے الفاظ میں یہ ہیں:۔

- ہر انسان محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب الاحترام ہے (بنی اسرائیل - ۷۰)
- ذرائع رزق ہر ضرورت مند کے لیے یکساں کھلے رہیں گے ان پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (حٰم السجدہ ۱۰ - الرحمٰن: ۱۰)
- کسی شخص کو دوسروں پر حکومت کا حق نہیں (آل عمران - ۷۹)
- خدا کی اونٹنی خدا کی زمین میں کھلے بندوں چرے گی (اعراف ۷۳)

یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایڈیٹر صاحب نے صرف قرآنی الفاظ کا ترجمہ کیا ہے اپنی طرف سے کوئی

لفظ نہیں بڑھایا۔ اونٹنی۔ الی آیت میں "کھلے بندوں" کے الفاظ قوسین میں دیئے ہیں۔ گویا کہ یہ جتایا ہے کہ صرف یہ دو الفاظ اپنی طرف سے مفہوم سمجھانے کے لیے اضافہ کیے ہیں، اس لیے بڑی احتیاط برتتے ہوئے ان کو قوسین میں کر دیا گیا ہے۔

اب ہم نمبر وار ان آیات کو لیتے ہیں اور ان میں ایڈیٹر کی تحریف اور فریب کو واضح کرتے ہیں:-

★ ہر انسان محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب الاحترام ہے (۱۷-۷۰)

اصل آیت عربی میں یوں ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۱۷-۷۰)

مولانا تھانوی، جنہوں نے ترجمہ میں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کی پیروی کی ہے مگر جدید اُردو استعمال کی ہے، وہ اس آیت کا یوں ترجمہ فرماتے ہیں: "اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی"۔ آربری اور پکتھال نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ مولانا تھانوی اور سلف کے تمام مفسرین یہی فرماتے ہیں کہ اس سے مطلب یہ ہے کہ حیوانات اور نباتات وغیرہ پر انسانوں کو فوقیت دی۔ انسان پر خدا کی نعمتیں اور مخلوق سے زیادہ ہیں۔ اس لیے انسان کی پکڑ بھی سخت ہوگی، اس بات پر اگلی آیت ۷۱ کا مضمون دلالت کر رہا ہے جس میں آخرت اور نامۂ اعمال کا ذکر ہے حیوانات اور نباتات اس حساب کتاب سے مبرا ہیں۔

ایڈیٹر مساوات نے اوّل تو مکمل آیت کا ترجمہ نہیں دیا۔ صرف پہلے چند الفاظ کو لیا ہے باقی طویل حصہ کو چھوڑ دیا۔ پھر "یکساں" کے لفظ کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ اس طرح سے اصل مفہوم کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اس معنی کا لفظ پوری آیت میں موجود نہیں۔ اسی کو تحریفِ لفظی کہتے ہیں۔ قرآن میں کہیں بھی یہ بات نہیں کہی گئی کہ تمام انسان یکساں واجب الاحترام ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس کہا گیا ہے:

... قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ..... (الزمر-۹)

ترجمہ: مولانا اشرف علی تھانوی "بھلا جو شخص اوقاتِ شب میں سجدہ وقیام کی حالت میں عبادت

کر رہا ہو۔ آخرت سے ڈر رہا ہو اور اپنے پروردگار کی رحمت کی امید کر رہا ہو۔ آپ کہیے کیا علم والے اور جہل والے دکھیں، برابر ہوتے ہیں۔ وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہلِ عقل (سلیم) ہیں۔

پھر ارشادِ الٰہی ہوتا ہے۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ .... (المومن - ۵۸)۔

ترجمہ: "اور نہیں برابر ہوتا اندھا اور آنکھوں والا اور وہ لوگ کہ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور (دوسرے) بدکار باہم برابر نہیں ہوتے، تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو"

ہم پوچھتے ہیں کہ ایڈیٹر صاحب کو آیت میں یوں قطع و برید کی کیا ضرورت پیش آئی؟ —— بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیکوکار اور بدکار، صالح اور فاسق، وفادار اور غدار، مسلمان اور غیر مسلم سب کو ایک ہی درجہ میں سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام دینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے ملک کی کالعدم عوامی لیگ اور دوسری سوشلسٹ پارٹیوں نے نہ صرف مسلم کا لفظ اپنی جماعتوں سے خارج کیا بلکہ غیر مسلموں کے لیے اپنے دروازے کھول دیئے حالانکہ اصل مسلم لیگ میں صرف مسلمانوں کو ممبرشپ کی اجازت تھی۔ اس طرح سے یہ لوگ قائداعظم کے دو قوموں کے اسلامی نظریہ کو ختم کر کے کانگرس کے ایک قوم کے کافرانہ نظریے پر فی الحقیقت عمل کر رہے ہیں۔

اسلامی اخوت کو ختم کرنے کے بعد دوسرا قدم ان کا یہ ہے کہ صوبائی عصبیت اور لسانی عصبیت کو ہوا دی جائے۔ ہندو بنگالی اور مسلمان بنگالی کو ایک قوم بتایا جاتا ہے۔ امیر غریب کو یکساں واجب الاحترام نہیں بتایا جاتا بلکہ امیروں کے خلاف منافرت پھیلا کر کاریں جلانے اور کارخانوں کو آگ لگانے کے گر سکھائے جاتے ہیں[1] پھر پنجابیوں، سندھیوں اور پٹھانوں کو جو سب مسلمان ہونے کی وجہ سے قرآنی حکم کے مطابق بھائی بھائی ہیں آپس میں لڑا دیا جاتا ہے۔ پارٹی میں جو شریف لوگ ہوتے ہیں وہ اگر غنڈوں کی شمولیت پر اعتراض کرتے ہیں تو ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی رُو سے بطور انسان ہونے کے سب یکساں واجب الاحترام ہیں اس لیے غنڈوں اور مجرموں کو پارٹی میں شامل کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔

اب ان کے حوالہ کی دوسری آیت کو لیجیے:

---

[1] مثلاً طارق علی کی کتاب NEW REVOLUTIONARIS کا پہلا صفحہ اُلٹتے ہی مولوٹاف کاکٹیل کی تصویر اور نسخہ نظر آتا ہے۔

● ذرائع رزق ہر ضرورت مند کے لیے یکساں کھلے رہیں گے۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (۴۱-۱۰-۱-۵۵-۱۰)

اب ہم حوالے کی دونوں آیات کو باری باری لیتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ جو ترجمہ انہوں نے کیا ہے وہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے۔

آیت ۴۱-۱۰ اور اس سے اگلی پچھلی آیات یوں ہیں:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ ۔۔۔۔ الخ

ترجمہ: "کہو کیا تم کفر کرتے ہو ساتھ اس کے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو دو دنوں میں۔ اور تم اس کے ٹھیراتے ہو، یہ ہے پروردگار تمام جہانوں کا اور اس نے زمین میں اس کے بیچ پہاڑ بنا دیئے اور اس (زمین) میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں، اس میں اس کے رہنے والوں کی غذائیں تجویز کر دیں۔ بیچ چار دن کے جو پورے ہیں پوچھنے والوں کے لیے۔ پھر آسمان کے بنانے کی طرف توجہ فرمائی اور وہ اس وقت دھوآں سا تھا۔"

آریری نے آیت کے مطلب کے طور پر یہی لکھا ہے کہ یہ تخلیق چار دنوں میں ہوئی جو مقدار میں برابر تھے (FOUR EQUAL DAYS) "سائلین" کا ترجمہ شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، مولانا تھانوی وغیرہ نے "پوچھنے والے" کیا ہے۔ امام طبری نے حسن بصری اور قتادہ سے مختلف طرق سے یہی معنی نقل کیے ہیں، مشہور شیعہ مفسر طبرسی کے نزدیک بھی یہی معنی محقق ہیں۔ البتہ طبری نے ابن زید کا مزید قول بھی نقل کیا ہے کہ (سواءً للسائلین) قدر ذالك على قدر مسائلهم، يعلم ذالك انه لا يكون من مسائلهم شئ الا قد علمه قبل ان يكون یعنی اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی حاجت کے مطابق اشیاء اور مختلف قوتیں زمین میں رکھ دی ہیں اور اللہ کو ان حاجات کے پیدا ہونے سے پہلے علم تھا کہ ان کو کس کس چیز کی حاجت اور ضرورت ہو گی۔ اس لیے سب چیزیں قبل ہی تخلیق فرما دیں۔

گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو علم تھا کہ انسانی آبادی کثرت سے دور دور پھیل جائے گی

اور انسان کو تیز رفتار ذرائع آمد و رفت کی ضرورت پڑے گی اس لیے زمین میں پٹرول وغیرہ کو تخلیق فرمایا علیٰ ہٰذا القیاس

راقم الحروف نے قریب قریب سب ہی معروف عربی تفاسیر دیکھیں مگر کہیں سے بھی سوشلسٹوں کی اس تعبیر کی تائید نہیں ہوتی۔ مصر کے مشہور مفسر المراغی نے لکھا ہے کہ یہ تخلیق کامل چار ایام میں کی گئی اور تمام حاجت مندوں جن میں انسان اور حیوان سب شامل ہیں ان کی ضروریات کا بندوبست کیا گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا قول یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یعنی کائنات کی ہر چیز اللہ ہی سے سوال کرتی ہے) دلالت کرتا ہے۔

ابن کثیرؒ کا قول ہے کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ اب دیکھیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (ابراہیم ۳۳-۳۴)

ترجمہ "اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا جو ہمیشہ چلتے ہی رہتے ہیں اور تمہارے نفع کے واسطے رات دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا اور جو چیز تم نے مانگی تم کو دی اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگر شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے۔ (مگر) سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی ظالم اور کفر کرنے والا ناشکرا ہے" یہاں یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کے مطابق سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان نے گھوڑوں کو سدھا کر ان پر سواری کرنی چاہی تو اس میں انہیں کامیاب کر دیا اور جب چاند پر پہنچنا چاہا تو ان کی اس خواہش کو بھی پورا کر دیا۔ اس خیال کو ڈاکٹر اقبال نے اپنی نظم میں یوں بیان کیا ہے:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں — ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ہم یہاں اتنا عرض کر دیں کہ قرآن میں جو دنیا کے چھ ایام میں تخلیق ہونے کا ذکر ہے وہ یہ عام دن نہیں ہیں بلکہ اللہ کے ہاں کا یوم ہزاروں لاکھوں سالوں کا بھی ہوتا ہے[1]۔ جارج گیمو نے اپنی کتاب

---

[1] قرآن میں ایک یوم ہزار سال اور پچاس ہزار سال کے برابر ہونے کا ذکر ہے۔

THE BIRTH AND DEATH OF THE SUN کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ کائنات سائنسی حساب سے چھ ارب سالوں میں پیدا ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں اسی طرف اشارہ ہے اور اس سے ایام کے برابر ہونے کا مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے اس بحث کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔

(باقی)

ضروری اعلان

ماہنامہ ترجمان القرآن کے ایجنٹ حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ وی پی پیکٹ واپس آجانے کی وجہ سے ادارہ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لہٰذا ایجنٹ حضرات توجہ فرمائیں اور وی پی پیکٹ وصول فرما کر اپنی اخلاقی ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہیے۔ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتے حوالۂ ڈاک کر دیا جاتا ہے، اس لیے تعاون کے جذبہ سے ادارہ کو ممنون فرمائیں۔

مینیجر

رسائل و مسائل

(ابوالاعلیٰ مودودی)

قومِ ثمود کے مساکن

سوال: ڈاکٹر نکلسن نے اپنی معروف تصنیف "اے لٹریری ہسٹری آف دی عربز" (عربوں کی ادبی تاریخ) کے پہلے باب میں "افسانۂ ثمود" کے زیرِ عنوان یہ رائے درج کی ہے:

"قرآن میں ثمود کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ ایسے مکانوں میں رہتے تھے جو انہوں نے چٹانوں سے کاٹ کر بنائے تھے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ محمد کو ان تراشیدہ غاروں کو صحیح حقیقت معلوم نہیں تھی جو آج بھی حجر (مداینِ صالح) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ مدینہ سے شمال کی طرف ایک ہفتے کے سفر پر واقع ہیں اور ان پر نبطی زبان میں جو کتبے کندہ ہیں انہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ مکانات نہیں بلکہ مقبرے ہیں" (ص ۳، کتابِ مذکور)

میں امید رکھتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں خاکسار کے شرحِ صدر کے لیے اپنی تحقیق سے آگاہی بخشیں گے۔"

جواب: نکلسن بچارے کو یہ بھی معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے بھی بارہا اس راستے سے گزرے تھے جہاں ثمودی عمارات واقع ہیں اور نبوت کے بعد بھی غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ کا اور آپ کے لشکر کا گزر وہاں سے ہوا تھا۔ اس زمانے کے اہلِ عرب خوب جانتے تھے کہ قوم ثمود کا علاقہ یہی ہے اور ثمود کے لوگوں ہی نے پہاڑوں کو کھود کر ان میں یہ عمارتیں بنائی تھیں۔ اسی وجہ سے قرآن کے اس بیان کو اس زمانے کے اہلِ عرب نے کبھی چیلنج نہیں کیا۔

میں نے خود حجر کے علاقے میں ثمودی عمارات بھی دیکھی ہیں اور نبطی علاقے میں بھی گیا ہوں اور ان کی قدیم عمارات کو دیکھا ہے۔ دونوں کے طرزِ تعمیر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ صرف یہ بات کہ ثمودی عمارات

پر آج نبطی کتبات پائے جاتے ہیں اس امر کا ثبوت نہیں ہو سکتی کہ یہ دراصل نبطی عمارات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں جب یہ علاقہ نبطیوں کے قبضے میں آیا ہو تو انہوں نے اپنے کتبات ان پر ثبت کر دیئے ہوں۔

سوال ۲: آپ کی عنایت پر بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کے اشارات سے مجھے غور و فکر کے لیے کافی مواد مل گیا' تاہم محسوس ہوتا ہے کہ گزشتہ مرتبہ مجھ سے عرض مطلب میں کوتاہی ہوئی ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ یہ عمارات ثمودی ہیں یا نبطی۔ نہ نکلسن نے اس امر کی نفی کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان عمارات کا مشاہدہ فرمایا تھا اور اہل عرب ان کے ثمودی ہونے کو تسلیم کرتے تھے۔ بلکہ خود نکلسن بھی ان کے ثمودی ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ اصل بات یہ تھی کہ قرآن پاک میں انہیں "بیوت" کہا گیا ہے۔ اگرچہ علی سبیل العموم ان سے کوٹھڑیاں (جو کسی بھی مقصد کے لیے ہوں) مراد لی جا سکتی ہیں تاہم قریب ترین تاثر یہی پیدا ہوتا ہے کہ مراد "گھر" ہیں۔ نکلسن یہ کہتا ہے کہ یہ "گھر" نہیں ہیں' "مقبرے" ہیں۔ اس دوران خاکسار نے ورق گردانی سے یہ معلوم کیا ہے کہ نکلسن ڈاؤٹی "DOUGHTY" کے حوالے سے یہ بات کہتا ہے جو ایک انگریز سیاح تھا جس نے ۱۸۷۵ء میں کاروان حج کے ساتھ سفر کرتے ہوئے حجر کے مقام پر توقف کیا' ان عمارات کی ڈرائنگ کی اور ان پر کھدی ہوئی عبارتوں کو نقل کر کے یہ مواد فرانس کے مشہور عالم السنہ سامیہ جوزف رینان کو بھیج دیا۔ بعد ازاں کیا ہوا' یہ میں معلوم نہیں کر سکا۔ بہر حال اسی شخص کے حوالے سے نکلسن نے یہ کہا ہے کہ ان کتبات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ یہ عمارات جن کو قرآن "بیوت" کے لفظ سے یاد کرتا ہے' فی الحقیقت مدفن ہیں۔

بلاشبہ کلام اللہ میں جو کچھ آیا ہے درست ہے اور اُس کے برخلاف جس کسی نے بھی جو کچھ نتیجہ نکالا ہے وہ ضرور کسی نہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہے' تاہم جب خالص علمی سطح پر تاریخی آثار کو گواہ بناتے ہوئے کوئی شخص کسی خاص مسئلے کی نشاندہی کرے تو اُسی سطح پر اُس کی تحقیق و تردید ضروری ہو جاتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ نکلسن کی یہ کتاب ایک طویل عرصے سے ہمارے ہاں متداول ہے اور ہر سال مسلمانوں کا ایک جم غفیر بچشم خود ان کتبات کو دیکھنے اور نقل کرنے پر قادر رہے' لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کیا کہ علمی سطح

پر اس الجھاؤ کا جواب دے دیتا۔

آپ نے تفہیم القرآن میں ثمود اور ان عمارات پر جو اشارات درج فرمائے ہیں اُن میں سے بعض ——— (بعض اس لیے کہ میں نے تمام جلدیں نہیں دیکھیں) ——— انہی دنوں میری نظر سے گزرے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے علاوہ بھی آپ اس مسئلے پر ضرور روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک تصاویری مہم بھی سر کی تھی۔ ان تصویروں کی ایک خاصی تعداد بھی میں نے دیکھی تھی۔ ان میں ان عمارات کی تصویر بھی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ان پر کھدی ہوئی عبارتوں کی کوئی الگ تصویر بھی ہمیں مہیا ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یہ کتبات تعداد میں کتنے ہیں؟ کس زبان میں ہیں؟ کس رسم الخط میں ہیں؟ کیا ہم کسی طرح ان کو پڑھ سکتے ہیں؟ کیا واقعی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ "مقابر" ہیں؟ اگر ہوتی ہے تو قرآن سے اس کی تطبیق کی کیا صورت ہے؟ کیا قرآن سے یہ ثابت نہیں کہ یہ "رہائش کے مکان" تھے؟ پھر کسی لکھنے والے نے کیوں ان پر وہ عبارات کندہ کیں جن سے یہ مقبرے ثابت ہوں؟

آپ نے جو قیاس ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے نبطیوں نے بعد کو یہ عبارتیں کندہ کی ہوں، نہایت فکر انگیز ہے، لیکن اس ضمن میں بھی تحقیقی سراغ رسانی ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآنی صداقت کا کوئی ناقابلِ تردید ثبوت مل جائے اور مستشرقین کی غلط فہمی کو خالص علمی سطح پر حرفِ غلط ثابت کیا جا سکے۔

جواب: میں نے ارض القرآن کے دورے سے پہلے ڈاؤٹی کا سفرنامہ پورا پڑھا تھا اور اس نے جو کچھ غلط فہمیاں قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ثمودی عمارات کے سلسلے میں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی ان کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہی میں نے الحجر اور مدائنِ صالح میں ثمودی عمارات کو دیکھا اور پھر نبطی علاقے میں جا کر نبطیوں کی تعمیر کردہ عمارات کو بھی دیکھا۔ دونوں قسم کی عمارتوں کے فوٹو میں نے لیے اور تفہیم القرآن جلد سوم میں ان کو شائع کر دیا تاکہ ہر شخص خود دیکھ سکے کہ نبطی عمارات اور ثمودی عمارات کے طرزِ تعمیر میں کیا فرق ہے۔ قوم ثمود اور انباط دونوں نے اپنے اپنے زمانے میں پہاڑوں کو کھود کر مکانات بنائے تھے۔ نبطی ثمود سے صدہا برس بعد ظہور میں آئے تھے اس وجہ سے ان کے زمانے میں ثمود کی بہ نسبت پہاڑ کھود کر مکان بنانے کا فن بہت زیادہ ترقی کر گیا تھا۔ ثمودی علاقے میں جو مکانات

موجود ہیں ان میں بعض ایسے ہیں جن کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسمبلی ہال کے طور پر استعمال ہوتے ہونگے۔ اور بعض دو تین کمروں پر مشتمل ہیں جو غالباً رہنے کے لیے استعمال ہوتے ہونگے۔ بعض میں صرف ایک چھوٹی یا بڑی کوٹھری ہے۔ وہاں کوئی آثار میں نے ایسے نہیں دیکھے جن سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ یہ ابتداءً مقبرے بنائے گئے ہونگے۔ سینکڑوں برس بعد جب نبطی اس علاقے پر قابض ہوئے تو ممکن ہے کہ انہوں نے ان کو مقبروں کے طور پر استعمال کیا ہو لیکن اب کوئی قبر کی نوعیت کی چیز وہاں نہیں پائی جاتی۔

کتبات کی زبان اور رسم الخط کے متعلق یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ قدیم سامی لغات کی زبانیں اور رسم الخط ایک دوسرے سے ماخوذ اور متشابہ چلے آرہے تھے۔ ثمودی، لحیانی اور نبطی زبان اور طرز تحریر میں تھوڑا تھوڑا فرق تاریخ کے دوران میں مسلسل ہوتا رہا ہے اور یہ فیصلہ کرنا عرب کے علم الآثار پر تحقیق کرنے والوں کے لیے خاصا مشکل ہوگیا ہے کہ کس خط کو خالص ثمودی اور کس کو خالص لحیانی اور کس کو خالص نبطی قرار دیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ثمودی عمارات پر بعد میں نبطیوں نے اپنے کتبات لکھ دیئے ہوں یا ان سے پہلے لحیانیوں نے انہیں لکھا ہو، یا ابتداءً خود ثمودیوں نے کچھ کتبات لکھے ہوں۔ قطعی طور پر تحقیق کے ساتھ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کن کا خط ہے۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث ڈاکٹر جواد علی نے اپنی کتاب تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد دوم صفحہ ۲۱۳ و مابعد، اور جلد ہفتم صفحہ ۳۶ تا ۵۶ میں کی ہے۔ اس سلسلے میں آپ تفہیم القرآن جلد سوم، سورۃ الشعراء، حاشیہ نمبر ۹۹ مع تصاویر ملاحظہ فرمائیں تو حقیقت آپ پر واضح ہوجائے گی۔

سورۃ طارق کے ایک مقام کی تشریح

سوال۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ ماہ ستمبر کے ترجمان القرآن میں آپ نے سورۃ الطارق کی آیات ۵ تا ۷ کا جو ترجمہ کیا ہے اور پھر اس کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے، اسے میں سمجھ نہیں سکا۔ ترجمہ یہ ہے:

"پھر انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔"

اس کے حاشیہ میں آپ کی تشریح میں نے بغور کافی دفعہ پڑھی ہے لیکن میں سمجھ نہ سکا۔ جہاں تک عملی مشاہدے کا تعلق ہے تو یہ مادہ فوطے (TESTICLE) میں پیدا ہوتا ہے اور باریک باریک نالیوں کے ذریعے بڑی نالیوں میں گزرتا ہوا پیٹ کی دیواروں میں کولہے کی ہڈی کے عین متوازی ایک نالی (INGUINAL CANAL) میں سے گزر کر قریب ہی ایک غدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ غدود کا نام PROSTATE ہے۔ اور پھر وہاں سے رطوبت لے کر اس کا اخراج ہوتا ہے۔ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے اس کے گزرنے کو میں سمجھ نہ سکا۔ البتہ اس کا کنٹرول ایک ایسے نروس سسٹم سے ہوتا ہے جو کہ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان جال کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ بھی ایک خاص حد تک۔ اس کا کنٹرول ایک اور غدود جو کہ دماغ میں ہوتا ہے اُس کی رطوبت سے ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہاں اخراج کا ہے (جو کہ ایک نالی کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے) میری درخواست ہے کہ آپ مجھے مفصل لکھیں کہ اس کی تفسیر کیا ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے (جس کے لیے معذرت خواہ ہوں) کہ آپ سائنٹیفک علم پر یقین رکھتے ہیں۔"

جواب: آپ چونکہ ڈاکٹر ہیں اس لیے اس بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگرچہ جسم کے مختلف حصوں کے افعال (FUNCTIONS) الگ الگ ہیں، لیکن کوئی حصہ بھی بجائے خود تنہا کوئی فعل نہیں کرتا بلکہ دوسرے اعضاء کے تعاون (CO-ORDINATION) سے اپنا کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ مادۂ منویہ بننے کی جگہ بلاشبہ فوطہ ہے اور وہاں سے اس کا اخراج بھی ایک خاص راستے سے ہوتا ہے لیکن معدہ، جگر، پھیپھڑے، دل، دماغ، گردے اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا مادۂ منویہ کے بننے اور نکلنے کا یہ نظام بطورِ خود اپنا کام کر سکتا ہے؟ اسی طرح مثال کے طور پر دیکھیے۔ پیشاب گردے میں بنتا ہے اور ایک نالی کے ذریعے مثانے میں پہنچ کر پیشاب کے راستے سے خارج ہوتا ہے۔ مگر کس چیز کے نتیجے میں؟ خون بنانے والے اور اس کو سارے جسم میں گردش دے کر گردے تک پہنچانے والے اعضاء اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا تنہا گردہ خون سے وہ مادے الگ کر کے مثانے میں بھیج سکتا ہے جن کے مجموعے کا نام پیشاب ہے؟ اسی لیے قرآن مجید میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ یہ مادہ ریڑھ کی ہڈی اور سینے کی ہڈیوں میں سے

نکلتا ہے بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اِن دونوں کے درمیان جسم کا جو حصّہ واقع ہے اُس سے یہ مادہ خارج ہوتا ہے۔ ـــــــــ یہ اس بات کی نفی نہیں ہے کہ مادۂ منویہ کے بننے اور اس کے اخراج کا ایک خاص نظامِ عمل (MECHANISM) ہے جس سے جسم کے کچھ خاص حصے انجام دیتے ہیں، بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظامِ عمل مستقل بالذات نہیں ہے۔ یہ اپنا کام اُس پورے نظام اعضاء کے مجموعی عمل کی بدولت انجام دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صُلب اور تَرائب کے درمیان رکھ دیا ہے۔ اِسی لیے مَیں نے یہ وضاحت کی ہے کہ پورا جسم اس میں شامل نہیں ہے، کیونکہ اگر ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں تب بھی یہ نظام کام کرتا رہتا ہے، البتہ صُلب اور ترائب کے درمیان جو اعضائے رئیسہ واقع ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہے تو یہ نظام اپنا عمل جاری نہیں رکھ سکتا۔ طبّی لحاظ سے اگر میری اس تشریح میں کوئی غلطی ہو تو براہِ کرم مجھے مطلع فرمائیں۔

مطبوعات

REVOLUTIONARY STRATEGY FOR NATIONAL DEVELOPMENT

قومی ترقی کے لیے ایک انقلابی اقدام

تالیف: جناب ابراہیم احمد بھاوانی۔
شائع کردہ: پرنٹ باؤنڈ لمیٹڈ۔۹ رسل چیمبرز
بری پلیس۔ لندن WC1-A 2JS.

صفحات ۸۶۔

اسے ملکی معیشت کے لیے ایک نیک فال کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک کے بعض صنعت کاروں نے جو صنعتی ترقی کے میدان میں وسیع تجربہ رکھتے ہیں ملک کے اقتصادی مسائل پر اظہارِ خیال شروع کیا ہے اسی سلسلے میں پہلے جناب یوسف حسین شیرازی کی چند فکر انگیز کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا ترجمان القرآن میں تعارف بھی کرایا جا چکا ہے۔ جناب ابراہیم بھاوانی کی زیرِ تبصرہ تالیف بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے وہ اس موضوع پر بعض دوسری تصنیفات پر نمایاں فوقیت رکھتی ہے فاضل مصنف نے اپنی تصنیف کا آغاز اس بدیہی حقیقت کے اعتراف سے کیا ہے' وہ اوّل و آخر مسلمان ہیں اور اس لیے تمام مسائل کا دینی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا چاہتے ہیں، اس لیے اُن کے جائزے میں وہ معروضیت پیدا نہیں ہو سکتی جو ریاضی میں نظر آتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ پاکستانی معیشت کے بارے میں آج تک جس قدر کتب لکھی گئی ہیں اُن میں یہ کتاب منفرد حیثیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں اُن اصولوں کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے جو اسلام معیشت کے دائرے میں پیش کرتا ہے۔

پھر اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بھاوانی صاحب مغرب کے مقلد نہیں ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ معاشی خوشحالی کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا مغربی سرمایہ داری کی تقلید یا اشتراکیت کی پیروی۔ ان دو صورتوں کے علاوہ معاشی ترقی کی کوئی تیسری صورت

ہمارے معیشت دانوں کو کم ہی نظر آتی ہے بھاوانی صاحب نے اس مفروضہ کا دلائل کے ساتھ ابطال کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہمارے معاشی استحکام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم مغرب کے پامال راستوں کو چھوڑ کر اسلام کی روشنی میں ترقی کے خطوط متعین کریں۔ اگر یہ حقیقت پسندانہ طرزِ عمل اختیار نہ کیا گیا تو پاکستان میں صورتِ احوال کی اصلاح کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اس کے علاوہ فاضل مصنّف نے اشتراکیت اور سرمایہ داری پر بھی بحث کی ہے اور اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام کے ساتھ ان کی پیوند کاری پاکستان کو تباہی کی طرف لے جانے والی ہے بھاوانی صاحب اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں اشتراکیت کا مخالف ہوں مگر میں مغرب کی مادہ پرستانہ سرمایہ داری کا بھی اتنا ہی دشمن ہوں (جتنا کہ اشتراکیت کا)۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں نظام مغرب کی ملحدانہ تہذیب کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اور اس بنا پر ایک تصویر کے ہی دو رُخ پیش کرتے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق تو سچے مسلمان کو ساری مغربی تہذیب کا باغی ہونا چاہیے۔ مغربی سرمایہ داری کے لیے میری نفرت کسی طرح بھی کم نہیں" ص ۱۰

اس کتاب میں معاشی تجربوں کے ساتھ ساتھ ایمان کی حرارت بھی محسوس کی جاتی ہے بھاوانی صاحب کے بعض خیالات سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اسے محض اس بنا پر رد نہیں کرنا چاہیے کہ اس کا مصنف اس ملک کا بہت بڑا صنعت کار ہے۔ سچائی جہاں سے بھی ملے اُسے قبول کرنے میں متامل نہ ہونا چاہیے۔

معیارِ طباعت نہایت اونچا ہے۔ قیمت درج نہیں۔

ما فی الضمیر | تالیف جناب سید ضمیر جعفری قیمت ۴۰،۵۰ روپے۔ صفحات ۲۴۴۔ ناشر: مکتبۂ اردو ڈائجسٹ۔ لاہور۔

کتاب کے مصنف شعر و ادب کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کے دو مجموعہ ہائے کلام جزیروں کے گیت اور لہو ترنگ شائع ہو کر اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مگر یہ دونوں مجموعے ان کی سنجیدہ شاعری کے نمونے ہیں۔

مانی الضمیر ضمیر صاحب کا پہلا مزاحیہ مجموعہ کلام ہے۔ ضمیر صاحب کا شاعرانہ کمال یہ ہے کہ اُن کی مزاح کسی طرح بھی طنز کے سانچوں میں نہیں ڈھلنے پاتی اور اُس کی شگفتگی اور لطافت شروع سے آخر تک برابر قائم رہتی ہے۔ قاری اُن کے کلام میں نہ تو ناصح کی وحشت محسوس کرتا ہے اور نہ کسی طنز نگار کی چوٹ، بلکہ یوں احساس ہوتا ہے کہ شبنم کے قطرے انسان کے دل و دماغ پر گر کر اُس کے ضمیر کو بیدار کر رہے ہیں۔ معیارِ کتابت و طباعت بڑا عمدہ ہے۔

پیشے اور اُن کا انتخاب | تالیف پروفیسر ریاض حسین ایم۔ اے۔ ملنے کا پتہ آر۔ این پبلیکیشنز۔ ۴۷ پی گلبرگ، لاہور۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت ۵۰ ،۴ روپے۔

ہمارے ملک میں مختلف پیشوں کے انتخاب کے لیے کوئی ایسی کتاب نہیں جس سے رہنمائی حاصل کی جاسکے۔ زیرِ تبصرہ کتاب نے اس خلا کو نہایت اچھے طریقے سے پُر کیا ہے۔ اس میں مختلف پیشوں اور مقابلے کے امتحانات کے بارے میں قابلِ اعتماد معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔

مسئلہ کشمیر | تالیف: جناب ممتاز احمد صاحب۔ شائع کردہ: المحراب، سمن آباد۔ لاہور۔ قیمت: ۵۰ ،۱۲ روپے۔ صفحات ۳۹۳۔

کتاب کے فاضل مصنف نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ کشمیر کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور پھر اسے بڑے سلیقے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب سات حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں کشمیر کے تاریخی پس منظر کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں الحاق کی سازش کے مختلف پہلوؤں پر نہایت جچے تلے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، تیسرے حصے میں اس مسئلہ کے بارے میں اقوامِ متحدہ کی بے حسی اور بددیانتی کی وضاحت کی گئی ہے۔ چوتھے حصے میں ان کوششوں کا ذکر ہے جو اس مسئلے کے حل کرنے کے لیے مذاکرات کی صورت میں کی گئیں۔ پانچواں حصہ جو فکری اعتبار سے اس کتاب کی جان ہے اس میں بھارت کے موقف کا بڑے علمی انداز سے جائزہ لیکر یہ بتایا گیا ہے کہ بھارت کا کشمیر پر غاصبانہ قبضہ قانون، انصاف اور اخلاق کی رُو سے کسی طرح بھی جائز نہیں۔ چھٹے باب میں مصنف نے مسئلہ کشمیر کی حقیقی نوعیت بیان کرتے ہوئے اس امر کی صراحت کی ہے کہ کشمیر پر

بھارت کے قبضے کا اصل مقصد دو قومی نظریے کو شکست دینا ہے۔ اس ضمن میں فاضل مصنف نے جیونی بھوشن داس گپتا کی کتاب سے یہ اقتباس بھی نقل کیا ہے :۔

" اگر کشمیر پاکستان کے ہاتھ سے جاتا ہے تو یہ دراصل نظریہ پاکستان کی شکست ہو گی۔ پھر اس کے بعد ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے پاکستان کے وجود کے خاتمے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا "

خود مصنف اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے بجا طور پر فرماتے ہیں :۔

" کشمیر ہمارے لیے کسی تنازعے یا جھگڑے کا نام نہیں ہے جسے کسی عدالت میں پیش کر کے اس پر فیصلہ کرا لیا جائے یا اس سے متعلق کم و بیش پر لین دین کر کے اسے ختم کر دیا جائے، یہ دراصل دو مختلف نظریۂ حیات کا تصادم ہے "

(ص ۳۵۳-۳۵۴)

یہ کتاب ادارۂ معارفِ اسلامی کراچی کی زیرِ نگرانی تیار کی گئی ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس پر نظرِ ثانی فرمائی ہے۔ یہ تصنیف ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ ہم ادارۂ معارفِ اسلامی کی اس پیش کش پر ادارے، فاضل مصنف اور ناشرین کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اس کے مطالعہ کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔

(بقیہ اشارات)

ملک میں افراتفری کی جو کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس میں چونکہ لوگوں کی جان و مال محفوظ نہیں اس لیے اُن کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے یہ سپاہ تیار کی جا رہی ہے اور اگر عوام اس یقین دہانی کے باوجود اسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھیں تو پھر اس کے وجود کی کوئی ایسی غرض و غایت بیان کر دی جاتی ہے جس کے خلاف لوگ لب کشائی نہ کر سکیں۔ چنانچہ دیکھیے کہ ہمارے ہاں جو ریڈ گارڈ تیار کی جا رہی ہے چونکہ اس سے عوام خائف ہیں اس لیے عوام کو یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ یہ فوج تو مقبوضہ کشمیر کو بھارت کے قبضے سے نجات دلانے کے لیے تیار کی جا رہی ہے۔ چونکہ یہ ایک ایسا پاکیزہ مقصد ہے جس سے کوئی پاکستانی بھی اختلاف نہیں کر سکتا اس لیے ہر شخص ریڈ گارڈ کو جانتے ہوئے بھی خاموش رہنے پر مجبور ہے کیونکہ اگر وہ اس کے خلاف لب کشائی کرے تو اُسے اشتراکیت کے علمبردار کشمیر دشمن ثابت کر کے عوام میں بدنام کریں گے۔

اس ملک میں اشتراکی انقلاب کے لیے سٹیج قریب قریب تیار ہے۔ جن جن اداکاروں نے اس خونی ڈرامے میں جو رول ادا کرنا ہے وہ نہ صرف انہیں سونپ دیا گیا ہے بلکہ انہیں اس کی باقاعدہ مشق بھی کرائی جا رہی ہے۔ یہ اداکار وقتاً فوقتاً موقع پا کر چند لمحوں کے لیے اسٹیج پر آتے اور اپنی اداکاری کے کچھ جوہر بھی دکھا جاتے ہیں مگر ابھی ان میں یہ حوصلہ نہیں پیدا ہوا کہ وہ باقاعدہ جم کر اس خونی ڈرامے کو شروع کریں۔ وہ کسی موزوں وقت کے منتظر ہیں۔ ان لوگوں نے عوام کے ذہنوں میں یہ غلط خیال بٹھا دیا ہے کہ اشتراکیت اس ملک کا مقدر بن چکی ہے۔ اسے مؤخر تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے مستقل طور پر ٹالا نہیں جا سکتا۔ یہ تاثر جہاں اسلام کے شیدائیوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے وہاں اپنے ساتھیوں کے حوصلے بلند کرنے اور خاموش تماشائیوں کو مرعوب کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ ایسے فیصلہ کن مرحلے پر معاشرہ بالعموم تین طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، ایک کسی انقلاب کے وہ پُرجوش علمبردار جو جان کی بازی لگا کر بھی اسے برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو خطرے کو بھانپ کر اس کا بڑی جرأت سے مقابلہ کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں کوئی ایسا نظام

حیات لاتے ہیں۔ جو اس سے کہیں زیادہ مفید اور کارآمد ہو۔ تیسرا طبقہ جو کسی معاشرے کی عظیم اکثریت پر مشتمل ہوتا ہے، خاموش تماشائیوں کا طبقہ یا ہر چڑھتے سورج کی پرستش کرنے والوں کا طبقہ ہوتا ہے۔ اس طبقے میں کوئی جان نہیں ہوتی۔ اُسے طاقت کا پلڑا جس طرف جھکتا نظر آتا ہے وہ اپنا وزن اسی میں ڈال دیتا ہے۔ ہم قوم میں ہراس نہیں پھیلانا چاہتے مگر ہم اُسے کسی خود فریبی کا شکار ہوتے بھی نہیں دیکھنا چاہتے جو بالآخر اُس کی بربادی کا سبب بنے۔ ہمارے نزدیک اس ملک کا مقدر اشتراکیت نہیں بلکہ اسلام ہے بشرطیکہ اسلام کے علمبرداران روح فرسا حقائق سے اغماض برتنے کے بجائے ان کے مقابلے کے لیے دل وجان سے آمادہ ہوں اور تاریخ کے اس نازک اور فیصلہ کن مرحلے میں مصلحت پسندی اور عافیت کوشی کا طرزِ عمل اختیار کرنے کے بجائے عزیمت کی راہ اختیار کریں اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک کہ اسلام اس ملک میں اپنی پوری آب وتاب سے قائم نہ ہو جائے۔ اسلام سرتاپا روشنی ہی روشنی ہے جس کے مقابلے میں کوئی تاریکی نہیں ٹھہر سکتی خواہ یہ سرمایہ داری کی تاریکی ہو یا اشتمالیت کی تاریکی، مگر یہ روشنی اسی صورت میں انسان کو حق وصداقت کے راستے پر گامزن رکھ کر اُسے منزلِ مقصود تک پہنچا سکتی ہے۔ جب نہ صرف عوام کے قلب و دماغ اس سے منور ہوں بلکہ انسان کی پوری اجتماعی زندگی اس کی ضیاپاشیوں سے بقعۂ نور بنی ہو۔

ضروری اعلان

تفہیم القرآن

جلد پنجم

تفہیم القرآن جلد پنجم طبع ہو کر جزبندی کیلئے
دفتری کے پاس پہنچ چکی ہے چونکہ جلد بندی میں
کافی وقت لگتا ہے اس لئے جوں جوں جلد تیار ہو رہی ہے
اسی لحاظ سے خریداران و ایجنٹ اصحاب کو علی الترتیب
روانہ کرتے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے

از ناظم ادارہ ترجمان القرآن